ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

ISSN 2321-4627

مئی 2021ء -/15روپے

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری' اردو اکیڈیمی کی جانب سے آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے کارناموں پر محیط کتاب ''شوکت عثمانیہ'' کی رسم اجراء کے موقع پر جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معذورین و معمرین ریاست تلنگانہ کی شال پوشی کی اور گلدستہ پیش کیا۔ تصویر میں جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ)' عزت مآب مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی' مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ و دیگر عہدیداران و اراکین عملہ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معذورین و معمرین ریاست تلنگانہ نے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے کارناموں پر محیط کتاب ''شوکت عثمانیہ'' کی رسم اجراء انجام دی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ)' عزت مآب مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری' جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی' مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ و دیگر عہدیداران و اراکین عملہ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے کارناموں پر محیط کتاب ''شوکت عثمانیہ'' کی رسم اجراء تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معذورین و معمرین ریاست تلنگانہ' جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ)' عزت مآب مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی' مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ' جناب سردار سلیم و دیگر عہدیداران و اراکین عملہ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، ثقافتی و تہذیبی ترجمان

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 06 شمارہ : 05 مئی 2021ء

زیرنگرانی : ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری
صدرنشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

مدیر : ڈاکٹر محمد غوث
ڈائریکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری
کمپوزنگ / ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپئے سالانہ -/150 روپئے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Dr. Mohammed Ghouse and Published by Mohammed Ghouse on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana, Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

حضرت داغ دہلوی

سعادت حسن منٹو

پروفیسر علی محمد خسرو

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

قرینہ

ہم کلامی		ڈاکٹر محمد غوث	4
اپنی بات		ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری	5
یادِ رفتگاں			
''پروفیسر سلیمان اطہر جاوید'' کچھ یادیں کچھ باتیں	:	پروفیسر فضل اللہ مکرم	6
پروفیسر علی محمد خسرو	:	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	12
''منٹو'' ایک بے باک خاکہ نگار	:	ڈاکٹر محمد کاشف	16
فصیح الملک بہادر ''داغ'' دلی، رامپور اور حیدرآباد دکن	:	محمد آصف علی	21
مضامین			
سماجی و سائنسی تحقیق ایک اجتماعی اور ملّی ذمہ داری	:	ڈاکٹر محمد غوث	32
نظم ''دھوکے کا گھر''	:	خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ	34
قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں غزلِ مسلسل	:	ڈاکٹر جعفر جری	35
مابعد کووڈ میڈیا کا منظر نامہ	:	محمد مصطفیٰ علی سروری	46
فاطمہ تاج کی غزل گوئی	:	اے۔ آر۔ منظر	50
سراج اورنگ آبادی کی غزلوں میں عشق حقیقی	:	ارشاد احمد	54
اُردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ''	:	سارہ بتول	60
افسانہ			
نیا قانون	:	سعادت حسن منٹو	68
طنز و مزاح			
قصہ ماڈرن چہار درویش	:	مظہر قادری	76
حصہ نظم			
نظم / غزل	:	جمیل نظام آبادی / ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل	81
غزلیں	:	اقبال خلش / الطاف شہریار	82

oOo

ہم کلامی

ماہنامہ قومی زبان میں محبان اردو اور اس رسالے کے قارئین کے لئے ہر ماہ اردو زبان و ادب کے میدان میں علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی مضامین شائع کئے جاتے ہیں، ان میں جہاں ان شعبہ جات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں تو وہیں اس زبان و ادب میں اپنی زندگیوں کو وقف کرنے والے ہمارے ہر دلعزیز ادیبوں، شعرائے کرام، محققین و نقاد اور فنکاروں کی بھی یاد تازہ کی جاتی ہے، ان کے احوال اور کارناموں کو خواص و عوام کے سامنے لایا جاتا ہے جس سے جہاں عام آدمی کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں یہ نگارشات ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک معاون دستاویز بنتی ہیں۔ اسی غرض کے لئے ہم اکثر و بیشتر خصوصی شمارے، گوشے اور یادرفتگاں کے عنوان سے ہمارے اسلاف کے کارناموں کو آپ کے سامنے لاتے ہیں۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ماہ مئی 2021 کے شمارے کو ہم نے ''یادرفتگاں'' کے عنوان کے تحت دکن اور دکن سے متعلق چار اساتذہ فن کے کوائف اور کارناموں کو اس شمارے میں اولیت دی ہے، ان میں فرزندان جامعہ عثمانیہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور پروفیسر علی محمد خسرو، نظام ششم نواب میر محبوب علی خان کے استاد فصیح الملک بہادر حضرت داغ اور بے باک افسانہ نگار سعادت حسین منٹو پر ممتاز اساتذہ و اسکالرس کے معیاری مضامین شامل ہیں، ان کے علاوہ اس شمارے کو دیگر ادیبوں اور اسکالرس کی ادبی و علمی تحریروں اور نامور افسانہ نگار سعادت حسین منٹو کے کلاسیکل افسانے ''نیا قانون'' کے علاوہ طنز و مزاح کے سلسلہ کی دلچسپ تحریر اور آخر میں شعرائے کرام کے کلام سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ تحریریں، یہ مضامین اور ماضی اور حال کے ہمارے اسلاف کے کارناموں کا مرقع ضرور آپ کی معلومات اور دلچسپیوں میں اضافہ کا سبب بنے گا۔

ریاست تلنگانہ میں ہمارا کاروان صدر نشین تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری صاحب کی سرپرستی میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ بات سب کے علم میں ہے کہ موجودہ ناگہانی آفت ''کوویڈ 19 جس کا سلسلہ گذشتہ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری ہے، اس کے باوجود بھی ہم نے اپنی ہمتوں کو یکجا رکھتے ہوئے فروغ اردو کے سلسلہ میں بہت سے اختراعی کام کئے ہیں، جن میں ماہ اکتوبر 2020 میں دسویں جماعت کے اردو اساتذہ کی آن لائن تربیت کا اہتمام کیا گیا جس میں ریاست بھر سے 800 اردو اساتذہ نے حصہ لیا، اسی طرح 11 تا 19 اپریل 2021 ریاست کے اردو اسکالرس کا آن لائن ورک شاپ منعقد ہوا جس میں پورے ہندوستان سے 1300 اسکالرس اور تلنگانہ سے 500 اسکالرس نے شرکت کی۔ یہ دونوں پروگرام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اشتراک و تعاون سے منعقد ہوئے۔ ان دونوں پروگراموں کی ہندوستان بھر سے اور دیگر ممالک سے بھی پذیرائی ہوئی، ہم ان پروگرامس میں اشتراک کیلئے مولانا آزاد یونیورسٹی کے شکر گزار ہیں۔ اس طرح کا ایک اور پروگرام ریاست کے اردو صحافیوں کے لئے عنقریب منعقد ہونے والا ہے، اس کے علاوہ انٹرمیڈیٹ کے جونیر لکچررس کے لئے بھی تربیتی پروگرام کی تجویز ہے۔ اکیڈیمی نے گرائجویشن کے اردو طلبہ کے لئے اردو نصابی کتابیں بھی شائع کی ہیں، علاوہ ازیں اکیڈیمی کی بعض سالانہ اسکیمیں بھی تکمیل کو پہنچی ہیں جن میں اردو مصنفین کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت اور طبع شدہ مطبوعات پر انعامات وغیرہ کی اسکیمات شامل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم کتاب ''شوکت عثمانیہ'' جس کے ذریعہ آصف سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر کے عوامی، علمی اور سماجی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس کی رسم اجراء عمل میں لائی گئی۔

بہرحال تلنگانہ اردو اکیڈیمی نامساعد حالات میں بھی اپنے ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہمارے لئے یہ بات باعث ہمت افزائی ہے کہ صدر نشین صاحب بھی باوجود ناسازی مزاج کے فروغ اردو کے ہر پروگرام میں ہماری سرپرستی فرمارہے ہیں اور اکثر پروگرامس میں بہ نفس نفیس شریک ہورہے ہیں۔ ہم ان کی مکمل صحت یابی کے لئے دعا گو ہیں اور آپ تمام قارئین سے بھی ان کی عاجلانہ صحت یابی کی دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت اس کرونا وبا سے ساری انسانیت کو جلد نجات دے اور اس وبا میں مبتلا ہونے والوں کو صحت کاملہ عاجلہ عطا کرے۔ تادم تحریر رمضان المبارک بھی اپنے دوسرے عشرے میں داخل ہوا ہے، میری اور ادارہ قومی زبان کی جانب سے تمام محبان اردو اور قارئین کی خدمت میں عیدالفطر کی پیشگی مبارک باد پیش ہے۔

محمد غوث

ڈاکٹر محمد غوث
ایڈیٹر

اپنی بات

آب ہو کہ آتش ہو پتھروں کی بارش ہو
کام کرنے والے والے تو کام کر ہی جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ صبر آزما وبائی حالات میں بھی تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کا کام کاج پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری ہے۔

گزشتہ دو سالوں میں اکیڈیمی نے مختلف جہتوں میں جو اختراعی کام انجام دئے ہیں اس سے اُردو دنیا میں حیدرآباد کی شناخت مزید مستحکم ہوگئی ہے' ان اختراعی کاموں میں جامعات کے اشتراک سے انجام پانے والی وہ تعلیمی سرگرمیاں بھی شامل ہیں جو اردو اساتذہ اور اسکالرز میں ملک گیر سطح پر مقبول ہوئیں' ان سرگرمیوں میں قابل ذکر ''اساتذہ کی تربیت'' اسکالرز کے لئے آن لائن ورک شاپ اور طلبہ کے لئے ورکشاپس وغیرہ شامل ہیں' مجھے یقین ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اردو اکیڈیمی کے ساتھ ساجھے داری سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔

حالیہ عرصے میں اُردو اکیڈیمی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان میں وہ نصابی کتابیں بھی شامل ہیں جو گرائجویشن کے اردو طلبہ کے لئے شائع کی گئی ہیں' انشاء اللہ تعالیٰ اردو میڈیم طلبہ کے لئے' ریسرچ اسکالرز کے لئے مفید منصوبے اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچتے رہیں گے۔ مثبت نظریات کے حامل روشن خیال اور زبان وادب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے محبان اردو کی تجاویز ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں' اکیڈیمی ہمہ جہت انداز میں کارآمد منصوبوں پر عمل پیرا ہے۔ اکیڈیمی کی پرشکوہ کتاب ''شوکتِ عثمانیہ'' بھی منظر عام پر آچکی ہے جو ضخامت اور معیار کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے' درحقیقت یہ کتاب عہد عثمانی کا بولتا مرقع ہے۔

بہرکیف! ماہنامہ قومی زبان کا تازہ شمارہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ آج اور کل کے تناظر میں ادبی نوادرات کی کہکشاں صفحات پر بکھری ہوئی ہے۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی یہی کوشش ہے کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں' اپنے حصے کے پھول ہر حال میں کھلاتے رہنا ہے اور اُردو زبان کی خوشبو سے اپنے قارئین کے احساسات کو مہکانا ہے۔

آخر میں اتنا ہی کہنا ہے کہ ماہ صیام اور عید الفطر آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سبھی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

''پروفیسر سلیمان اطہر جاوید'' کچھ یادیں کچھ باتیں

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے آگے ہم زانوئے تلمذ تہہ نہیں کرتے لیکن وہ کسی طور استاد سے کم نہیں ہوتیں۔ان بڑی شخصیتوں میں سے ایک پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ہیں۔ میں نے انھیں پڑھا، دیکھا، سنا اور بہت کچھ سیکھا ہے۔ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد روزنامہ منصف کا مقبول کالم ''میرا مطالعہ'' سے ان کا تعارف ہوا۔ایک زمانے کے بعد جب میں نے ان سے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا کہ ''میں آپ کو پہلے سے جانتا ہوں'' میرا حیران ہونا فطری تھا۔

'' آپ روزنامہ رہنمائے دکن میں شائع ہوتے رہے ہیں اور میں نئے لکھنے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میں طلباء و نوجوانوں کی تحریریں دیکھتا ہوں اور جو مسلسل لکھتے ہیں ان کے نام یاد رہ جاتے ہیں''۔

بڑی شخصیتیں اسی لئے بھی بڑی ہوتی ہیں کہ وہ چھوٹوں سے نہ صرف محبت و شفقت سے پیش آتی ہیں بلکہ ان کی ہمت افزائی فرما کر انھیں بھی بڑا بنا دیتی ہیں۔آج جو کچھ ہوں ایسی ہی شخصیتوں کی وجہ سے ہوں۔

مجھے قطعی اس بات کا علم نہیں تھا کہ جاوید صاحب پٹھان ہیں کیوں کہ پٹھانوں کی سی خوبیاں ان میں بظاہر دِکھائی نہیں دیتی تھیں ۔ میں نے پٹھانوں کے لطیفے بہت سن رکھے تھے اور یہ بھی سمجھ بیٹھا تھا کہ پٹھان دراصل اردو والوں کے ''سردار جی'' ہوتے ہیں۔ان کا اصل نام سلیمان خان ہے اور ہندوستان میں جس سال ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا تھا اسی سال آپ نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ جب بھی حیدرآباد کے قدیم محلے مستعد پورہ سے گزر ہوتا ہے تو جاوید صاحب بے اختیار یاد آجاتے ہیں۔اس محلے میں پیدائش کی وجہ سے وہ تاحیات مستعد اور چاق وچوبند رہے۔ ''چادرگھاٹ'' جو میرے گھر سے بہت قریب ہے، کے کالج سے میٹرک اور انٹر کامیاب کیا۔پھر جامعہ عثمانیہ کے سایہ عاطفت میں رہے۔ بی اے، ایم اے اور پی ایچ۔ ڈی کی سندیں اور صلاحیتیں اسی مادرِ علمیہ سے حاصل کیں۔وہ ہائی اسکول سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے شاگرد رہے اور انہیں ہی اپنا آئیڈیل بنایا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ایک بہت بڑا اور باوقار نام ہے۔زبان و ادب کے حوالے سے آپ کی غیر معمولی خدمات ہیں۔تخلیق ہو کہ تحقیق یا تنقید یا پھر درس و تدریس، ایسا کون سا رخ ہے جس سے جاوید صاحب نے روشن نہ کیا ہو۔انہوں نے اس پیشہ کو مقدس پیشہ بنائے رکھا اور اس پر ادبی سیاست اور کسی قسم کی خودغرضی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیں۔میں اکثر سوچا کرتا تھا وہ جامعہ کے سپوت ہیں، شہر حیدرآباد کے فرزند اور تصنیف و تالیف کا معتبر نام ہونے کے باوجود حیدرآباد کی کسی جامعہ میں نہ تو ان کا تقرر ہوا اور

نہ ہی ترقی۔۔۔! آخر کیوں؟ اس ضمن میں پروفیسر گیان چند جین نے یوں وضاحت کی ہے:

''ڈاکٹر محمد سلیمان خان المعروف بہ سلیمان اطہر جاوید نے اس بیہڑ غیر اردو دشت میں عمر عزیز گزار دی۔ تیلگو کے سمندر کے بیچ شعبہ اردو کو مستحکم کیا اور ہند و پاک میں اس کے نام کو آشنا کرایا۔ چوٹی کے اردو شعبوں کے پیچھے دوسری صف میں لا کھڑا کیا۔۔۔ مجھے ایک احساس جرم ہے کہ جب میں حیدرآباد یونیورسٹی میں صاحب اقتدار تھا' میں نے اس خصوص میں کچھ نہیں کیا۔ اب تلافی مافات ممکن نہیں۔۔۔ میری پختہ رائے ہے کہ دکن کی چاروں ریاستوں میں ڈاکٹر مغنی تبسم اور سلیمان اطہر جاوید ہی صف اول کے نقاد ہیں۔ یہاں کی خاک سے ابھرے تیسرے ممتاز نقاد وحید اختر اس علاقے کو چھوڑ چکے ہیں اس لیے شمار سے باہر ہیں''

(مضمون سلیمان اطہر جاوید اور رشید احمد صدیقی' مشمولہ نذر جاوید مرتبہ مظفر شہ میری ص۔۲۴)

قدرت نے جاوید صاحب کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ شاعر تھے' صحافی تھے' کالم اور خاکہ نگار تھے' محقق و نقاد تھے' شفیق استاد تھے اور ان سب سے بڑھ کر وہ ایک بہترین انسان تھے۔ انسان دوستی ان کا عقیدہ تھا' احترام انسانیت ان کا ایمان تھا۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کا مسلک تھا۔ طلبہ میں تخلیقی و تنقیدی و تحقیقی جوہر کو پیدا کرنا ان کا مقصد حیات تھا۔ اپنی ساری زندگی اسی غرض و غایت کے حصول میں وقف کر دی۔ سیدھے سادھے انسان تھے۔ سادگی ہی ان کا فیشن تھا۔ ان کی بہت سی تصانیف اس بات کی غماز تھیں کہ وہ پڑھنے لکھنے والے استاد ہیں۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

رشید احمد صدیقی۔ حیات اور فن' اسلوک اور انتقاد' تنقید شعر' ادب میں ابہام اور اس کے مسائل' چہرہ چہرہ داستان' تنقیدی افکار' مختصر تاریخ تلگو ادب اور فنون لطیفہ' مکاتیب رشید احمد صدیقی' اردو شاعری میں اشاریت' عزیز احمد کی ناول نگاری' تنقید اور تہذیب' رشید احمد صدیقی (ساہتیہ اکیڈیمی ایڈیشن)' اقبال۔ ماورائے دیر و حرم' غالب کے چند نقاد' عزیز احمد کے افسانے' ساحر لدھیانوی' آنگن آنگن دکھ کے پیڑ' بزم چراغاں' دیوان غالب کا پہلا شعر' ادبی ڈائری' ادب کا بدلتا مزاج' غالب اور غالب قابل ذکر ہیں۔

سلیمان اطہر جاوید نے شاعری کا مزہ بھی چکھا ہے گو کہ وہ میدان نثر کے شہ سوار تھے مگر شعر اور شعری مزاج سے آشنا تھے۔ شعر کی دبیز پرتوں کو کھولنے میں ماہر تھے۔ ان کی کچھ غزلیں گو کہ روایتی ضرور ہیں مگر اپنے مخصوص لب و لہجہ کی بدولت منفرد نظر آتی ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

وہ آج تک بھی پشیماں جواب پر اپنے
میں کاش اس سے نہ کرتا سوال ایسا تھا

میں کیا بتاؤں کتنوں کو رشک ہے مجھ پر
ترے کمال میں میرا زوال ایسا تھا

خواب کی تعبیر ہم کیسے تلاش کیا کریں
خواب کی تعبیر تک ہر واسطہ رخصت ہوا

یہ شعر دیکھیں، اس کی اثر آفرینی دیکھیں، جو بے اختیار دل کو چھو جاتا ہے:

دیکھ کے اس کو دیکھ نہ پایا، چھو کر اس کو چھو نہ سکا
کوئی پوچھے کیسا تھا وہ، میں کیا بتاوں کیسا تھا وہ

جاوید صاحب کو بچپن سے ہی لکھنے کا شوق تھا، ابھی آٹھویں جماعت میں ہی تھے کہ ان کی پہلی کہانی رہنمائے دکن کے بچوں کے صفحہ پر شائع ہوئی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ آپ کی تخلیقات مسلسل شائع ہونے لگی تھیں۔ ابھی بی اے میں زیر تعلیم تھے کہ روزنامہ پیام کے بچوں کا صفحہ ترتیب دینے لگے، پھر کچھ دنوں بعد روزنامہ سیاست سے بھی وابستہ ہوے۔ آخر کار انہیں دفتر عطیات میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ مالی پریشانیوں کی وجہ سے اس کلرکی نے انہیں بہت سہارا دیا مگر وہ آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اسی دوران انہوں نے سیاسی موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ انہیں رہنمائے دکن کی ملازمت کا آفر ملتے ہی کلرکی سے استعفیٰ دے دیا اور ایم اے اور پی ایچ۔ ڈی اردو کے ساتھ ساتھ رہنمائے دکن میں ملازمت جاری رکھی۔ وہ کئی برس تک سب ایڈیٹر بنے رہے اور اپنا پسندیدہ کالم ''رفتار سیاست'' لکھتے رہے جو بے انتہا مقبول ہوا۔ محض اس کالم کی بدولت پیر کا رہنمائے دکن زیادہ تعداد میں فروخت ہوا کرتا تھا۔ ایک طویل عرصے بعد انہوں نے روزنامہ منصف کا ''رفتار ادب'' اور ''میرا مطالعہ'' جیسے بہترین کالم لکھنے شروع کئے۔ کئی برسوں تک یہ کالم زندہ رہے جسے انہوں نے بلا معاوضہ لکھا۔ پھر روزنامہ سیاست میں ''ادبی ڈائری'' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ غرض انہوں زندگی بھر ادبی کالم نگاری کو رواج دیا جو کسی اور اردو ادیب کے بس کی بات نہیں تھی۔

خاکہ نگاری میں بھی انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ جس سے متاثر رہے اس کا بہترین خاکہ لکھا۔ ان کے لکھے خاکوں میں نہ صرف اس شخصیت کے مختلف پہلو روشن ہوتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان محبت والفت اور بھائی چارگی و انسیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ انہوں نے جس کو بھی چاہا خلوص سے چاہا اور محبت و محنت سے اس پر لکھا تبھی تو ان کے خاکوں میں ایک مقدس رشتہ نظر آتا ہے جو ایک استاد و شاگرد، قلمکار و قاری اور دوست و دوست کے درمیان ہوتا ہے۔

سلیمان اطہر جاوید کے گیارہ خاکوں و مرقعوں کا پہلا مجموعہ ''چہرہ چہرہ داستان'' ہے۔ جس میں ایک تہذیب ایک موت، جامعہ عثمانیہ مرحوم، زور صاحب، سروری صاحب، مولاناؒ، غروب آفتاب، جنگل اداس، اناللہ و انا الیہ راجعون، رفعت صاحب، یونس صاحب، دلداری عروس سخن شامل ہیں۔ جب کہ خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''بزم چراغاں'' ہے۔

نواب میر عثمان علی خان بہادر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوے خاکہ ''ایک تہذیب ایک موت'' لکھا ہے۔ جس میں حیدرآباد اور اس کی ایک ایک چیز سے ان کی گہری عقیدت اور شدید محبت جھلکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حیدرآباد میرے نزدیک'' ایک استعارہ ہے، ایک علامت ہے، ایک اشارہ ہے۔ ''حیدرآباد میرے نزدیک''

یادِ رفتگاں

چار مینار کا نام بھی ہوسکتا ہے جو سالہا سال سے سر بلند و سرفراز قطب شاہوں کی عظمت و شکوہ کی شہادت دیتا ہے۔

حیدرآباد کو رود موسی بھی سمجھتا ہوں جو ہر دم رواں دواں ہے اور آج بھی مختلف حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستانیں اپنی مثل آئینہ سطح آب پر منعکس کرتی ہیں۔حیدرآباد میرے خیال میں کتب خانہ آصفیہ بھی ہے جہاں علم و ادب کے قارون کا خزانہ محفوظ ہے۔ جہاں آگہی آج بھی تسکین جاں پاتی ہے۔حیدرآباد میرے لئے جامعہ عثمانیہ بھی ہے جو کئی نسلوں کی خالق ہے رنگ و روشنی کا سرچشمہ ہے۔آج نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں علم کی جتنی روشنی ہے وہ کسی نہ کسی طرح اور کچھ نہ کچھ اسی جامعہ کی شمع فروزاں کی مرہون منت ہے اور ان سب سے بڑھ کر حیدرآباد ایک گنگا جمنی تہذیب کا نام ہے جو بڑی دلنواز اور دلداہ ہے۔اپنا ایک وزن وقار اور حجم رکھتی ہے۔ حیدرآباد میرے نزدیک حضور نظام آصف سابعؒ کا نام بھی ہے میں حیدرآباد اور حضور نظام کو ایک دوسرے سے جدا قرار نہیں دے سکتا''۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور آپ کے استاد تھے بلکہ تحقیق و تنقید سے لگاو ڈاکٹر زور کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔اپنے محبوب استاد کے انتقال پر آپ نے جو جذباتی کیفیت کا اظہار کیا ہے وہ ان سے گہری وابستگی کا غماز ہے۔وہ لکھتے ہیں:

'زورؔ صاحب چل بسے۔نہیں! ایک تحریک چل بسی۔ایک ادارہ چل بسا بلکہ ایک عہد چل بسا۔کسی نے اردو زبان کو لوٹ لیا۔حیدرآباد کی ادبی تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا۔دکن کا ایک متوالا۔ایک عاشق زور چلا گیا۔آہ یہ کیا ہوگیا۔یہ کیوں ہوگیا۔کیوں ہوگیا!! آہ.... وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور کشمیر میں پیوند خاک! کیوں زور صاحب'زورؔ صاحب جیسی شخصیت مرتی کہاں ہے۔زورؔ صاحب تو دراصل ان کارناموں کا نام ہے جو آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ کارنامے زندہ و باقی رہیں گے۔زورؔ صاحب مر نہیں سکتے۔ وہ جاوداں رہیں گے۔''

تحقیق و تنقید' پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا اصل میدان ہے۔اس حوالے سے آپ کی کئی ایک تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔آپ کا تحقیقی مقالہ ''رشید احمد صدیقی۔حیات اور فن''، جو پروفیسر مسعود حسین خان کی نگرانی میں لکھا گیا اور جس پر جامعہ عثمانیہ نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری سے نوازا تھا' اردو تحقیق و تنقید کا بہترین نمونہ ہے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔اس کتاب کو اردو ادب کے جید علماء نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔رشید احمد صدیقی کی کتاب ''طنزیات و مضحکات''، پر کلیم الدین احمد نے زبردست تنقیص کی تھی جس پر سلیمان اطہر جاوید نے نہایت دیانت داری سے نقاد کے فرائض انجام دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

کلیم الدین احمد جو تنقید نہیں مذمت کرتے ہیں اور جن کو اردو کا تنقید نگار نہیں' مذمت نگار کہنا چاہیے۔

رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری اور خصوصاً 'طنزیات و مضحکات' پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔انہوں نے

اپنی روایتی انتہاپسندی سے ضرور کام لیا ہے۔تاہم یہاں ان کی رائے سے اختلاف کی بہت کم گنجائش ہے۔''

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا تنقیدی شعور کافی توانا ہے۔وہ کسی ازم کے پابند نہیں اور نہ ہی وہ کسی جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہیں تبھی تو انہیں شعبہ تنقید میں ایک معتبر نام مانا جاتا ہے۔اسی لیے حیات اللہ انصاری نے کہا تھا کہ ''ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کو تنقید کے میدان میں آے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے لیکن اس نے اتنے ہی عرصہ میں صف اول کے نقادوں میں اپنی جگہ بنالی ہے اس کی تنقید کسی بھی ازم کا شکار نہیں لیکن ساتھ ساتھ اس میں سماجی حیثیت اور مخصوص آگہی پوری آب وتاب سے پائی جاتی ہے۔اس کا ذوق بھی گہرا اور متوازن ہے۔وہ کانٹوں میں پھول تلاش کرلیتا ہے اور یہ بھی دیکھ لیتا کہ پھول کتنے کانٹوں میں گھرا ہے''۔

پروفیسر جاوید صاحب ایک دردمند دل رکھتے تھے اور میرے تئیں ان کا ہمیشہ نرم گوشہ رہا ہے۔چوں کہ میں بچپن سے ہی لکھتا پڑھتا رہا ہوں اور میری کہانیاں بھی رہنماے دکن میں شائع ہوتی رہی ہیں اس لیے وہ مجھ سے غائبانہ طور پر ہی سہی مجھے جانتے تھے۔ایک دفعہ وہ اردو ہال کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے تھوڑا جلدی آگئے تھے۔وہ سیدھا میرے کمرے میں آے اس وقت صرف میں ہی کالج میں تھا' مسکراتے ہوے پوچھا ''تو یہاں ہے آپ کا قیام؟

میں نے انہیں دروازے پر دیکھا تو بے اختیار کھڑا ہوگیا اور میز سے کتابوں کو سمیٹتے ہوے ان کی جانب لپکا اور نہایت ادب سے اندر لے آیا۔

''سر آپ کیا لیں گے؟''

''بھئی ہم تو کھاتے پیتے رہتے ہیں۔رہنے دیجیے''

میں نے فون کرکے اٹینڈر کو بلایا اور کچھ چیزیں منگوائیں۔انہوں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوے کہا کہ ''آپ پابندی سے لکھتے رہتے ہیں جسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔آپ یوں ہی لکھتے پڑھتے رہیں۔''

''محترم! میں نے آپ کو دیکھ کر اور پڑھ کر لکھنا شروع کیا ہے۔آپ ہمارے آئیڈئل ہیں۔''

''اچھا۔۔۔آپ کو ایک بات بتاوں' میں اسی اورینٹل اردو کالج سے تین چار ماہ کے لیے درس وتدریس سے وابستہ تھا اور یہیں سے ایس وی یونیورسٹی جوائن کیا تھا اور میں چاہتا ہوں آپ کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہو'

''اللہ کرے ایسا ہی ہو'' مجھے کچھ طمانیت سی محسوس ہورہی تھی۔لیکن ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ میں تو کئی دنوں سے کوشش کررہا ہوں مگر کہیں کوئی سبیل نظر نہیں آتی''

''ہمارا کام کوشش کرنا ہے' باقی سب اللہ پر چھوڑ دیں'' انہوں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

''آپ کو ایک اور بات بتاوں ۔۔۔آپ جس پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں وہی شخص آپ کو یونیورسٹی میں جانے سے روک رہا ہے'' انہوں نے چاے کی چسکی لیتے ہوے کہا۔

اوہ ۔۔۔ ہوسکتا ہے۔۔۔لیکن وہ کون ہے؟ میں ابھی بھی حیران تھا۔

چھوڑیے اس بات کو۔۔۔ جب اللہ چاہے تو کون روکے؟۔۔۔۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ ایک نہ ایک دن یونیورسٹی میں ضرور داخل ہوں گے اور اس دن مجھے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرا مقام یونیورسٹی کا شعبہ ہے کالج نہیں۔

اب میں کیا کہوں ۔۔۔ پورے پچیس سال گزر گئے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد کو چھوڑے ہوئے ۔۔۔

آخر کار شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں بحیثیت پروفیسر میرا تقرر ہوا اور میں پچیس سال بعد یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ان دنوں میں نے سن رکھا تھا کہ جاوید صاحب بہت علیل ہیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ خلیجی ملک میں رہتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان تک یہ بات پہنچادوں کہ آپ کی دعائیں قبول ہوئی ہیں اور میں بھی اورینٹل اردو کالج سے سنٹرل یونیورسٹی یونیورسٹی پہنچ گیا ہوں۔۔۔ ابھی مجھے جوائن کیے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ جاوید صاحب اب نہیں رہے۔ آپ کے انتقال پُر ملال سے بے انتہا تکلیف ہوئی اور مزید دکھ اس بات کا تھا کہ میرے تقرر کی اطلاع ان تک نہیں پہنچا پایا تھا جو میرے سچے بہی خواہ تھے۔ مجھے رہ رہ کر ان کی وہ بات یاد آرہی تھی کہ ’’ آپ بھی اس کالج سے یونیورسٹی جوائن کریں گے جیسا میں نے کیا تھا‘‘۔

اب ایسے مخلص لوگ کہاں ہیں جو ہماری کامیابیوں سے خوش ہوتے ہوں اور دعائیں دیتے ہوں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ ان کے ہی شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

اب کہاں جائیں کہ کوئی سمت کوئی رہ نہیں
اس کا جانا تھا کہ اک اک رستہ رخصت ہوا

☆☆☆

پروفیسر فضل اللہ مکرم
صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 046 500 (تلنگانہ)

oOo

یادِ رفتگاں

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

اُردو زبان بہت آسان ہے، اس کو بہت جلد سیکھا جاسکتا ہے۔
اس زبان کے فروغ کی کوشش ہم سب کی ذمہ داری ہے۔
خود بھی اردو پڑھیں، اپنی نئی نسل کو اس زبان کی طرف راغب کریں۔

پروفیسر علی محمد خسرو

ماہر معاشیات، ماہرِ تعلیم، محقق و دانشور، مدبر و منتظم، سفارت کار اور حکومت کے مشیر و صلاح کار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر سید علی محمد حسینی خسرو کا شمار ان ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے جن کا خمیر حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے اٹھا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اپنی روشن خدمات سے ایک دنیا کو مستفید کیا۔

سید علی محمد حسینی خسرو (آمد: یکم مئی 1925 – رخصت: 23 اگست 2003) حیدرآباد دکن کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا نواب جعفر یار جنگ بہادر ایک تعلقدار تھے اور ان کے نانا نواب دستگیر نواز جنگ بہادر، حضورِ نظام اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع کے پرسنل سکریٹری تھے۔

سید علی محمد خسرو کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کی تکمیل کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ کا رخ کیا اور مشہور یونیورسٹی لیڈز سے 1952 میں معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر سید علی محمد خسرو کا میدان معاشیات تھا۔ انہوں نے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز جامعہ عثمانیہ سے کیا۔ دہلی اسکول آف اکنامکس، دہلی یونیورسٹی میں 1957 سے 1974 تک وہ معاشیات کے پروفیسر رہے۔ اس مدت میں انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور ایک ممتاز محقق معاشیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

پروفیسر علی محمد خسرو کی معاشیات اور دیگر موضوعات پر بائیس 22 کتابیں ہیں۔ تحقیقی مقالات اور ان کی نگرانی میں لکھے جانے والے مقالات کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ بین الاقوامی سطح پر انہیں ایک محقق اور ماہر معاشیات کی حیثیت سے شہرت حاصل تھی۔ وہ ہندوستان کے علاوہ ایم آئی ٹی یونیورسٹی امریکہ کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ انگلینڈ اور دیگر ممالک میں کئی یونیورسٹیز اور انڈسٹریز میں ان کے لیکچر منعقد ہوا کرتے تھے۔

مشہور جریدہ فینانشیل ایکسپریس کے وہ ایڈیٹر رہے۔ انہیں انسٹیٹیوٹ آف اکنامک گروتھ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ آغا خان فاؤنڈیشن انڈیا کے صدرنشین مقرر کئے گئے۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پبلک فینانس اینڈ پالیسی، دہلی کے چیرمین بنائے گئے۔ سینٹر فار اکنامک اینڈ سوشیل اسٹڈیز، حیدرآباد کے بھی چیرمین مقرر کئے گئے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر رہے۔ ایر انڈیا کے بھی ڈائرکٹر رہے۔ حکومتِ ہند کے کمیشن برائے رزاعت کے رکن مقرر کئے گئے۔ انڈین اکنامک ایسوسی ایشن کے صدرنشین رہے۔ انڈین اگلریکلچر اکنامکس کانفرنس کے صدرنشین مقرر ہوئے۔ حکومتِ ہند کی

اوراقِ گل

جانب سے پرائم منسٹرس اکنامک ایڈوائزری کونسل کے رکن مقرر کئے گئے۔ وہ ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈائریکٹر اور اس کے تحت کئی کمیٹیوں کے چیرمین بھی رہے۔

اسی طرح معاشی معاملات میں وہ حکومت ہند کے مشیر رہے۔ وزیراعظم اندرا گاندھی اپنی معاشی پالیسیوں پر ان سے صلاح ومشورہ کیا کرتی تھیں اور ان کے مشوروں کو اہمیت دیتی تھیں۔ انہیں حکومت ہند کی جانب سے گیارہویں فینانس کمیشن کا چیرمین بنایا گیا، اس کمیشن نے نہایت اہم سفارشات پیش کیں۔

سابق وزیر اعظم ہند اٹل بہاری واجپائی نے پروفیسر علی محمد خسرو کی سفارتی صلاحیتوں اور بین الاقوامی تعلقات کے پیش نظر انہیں اپنے لاہور بس یاترا کے خصوصی وفد میں شامل رکھا جس سے وہ مسئلہ کشمیر کی یکسوئی اور خیر سگالی روابط استوار کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح سویت روس، پاکستان اور جرمنی کے ساتھ سفارتی معاملات میں ان کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

حکومتِ ہند کی جانب سے پروفیسر علی محمد خسرو کو جرمنی میں سفیر ہند مقرر کیا گیا۔ انڈو- جرمن تعلقات میں پروفیسر خسرو کی دوراندیشی، دانش مندی اور سفارتی بصیرت کو بڑا دخل ہے۔ جرمنی کی حکومت کی جانب سے انہیں اعلیٰ ترین شہری اعزاز، سویلین ایوارڈ، کمانڈرز کراس ایٹ دی آرڈر آف میرٹ دیا گیا۔

پروفیسر سید علی محمد خسرو کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں اور حیثیتوں — ماہرِ معاشیات، معاشی پالیسی ساز اور حکومت کے مشیر وصلاح کار، محقق ومصنف، کے علاوہ ان کے تعارف اور ان کی شہرت کی اہم وجہ، ان کا ملک کے مشہور و ممتاز تعلیمی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننا ہے۔ وہ ہندوستان کی اس دانشگاہ کے پندرہویں وائس چانسلر تھے۔ ان کی پانچ سالہ مدت کار ستمبر 1974 سے ستمبر 1979 تک محیط ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک دانشور، ماہر تعلیم، مدبر ومنتظم کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلروں میں جو مقبولیت پروفیسر خسرو کو حاصل ہوئی، وہ صرف انہیں کے ساتھ خاص ہے۔ وہ طلبہ سے بڑی اپنائیت اور شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے۔ وہ جمہوری اقدار پر یقین رکھتے تھے۔ طلبہ کے مسائل کی یکسوئی کے لیے طلبہ سے گفت وشنید کرتے اور ان کے تمام جائز مطالبات تسلیم کرتے تھے۔

ان کے دور میں علی گڑھ میں طلبہ کے داخلے بہت ہوئے اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ وہ کسی طالب علم کو مایوس لوٹانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر ان غریب طلبہ کو داخلہ نہ ملے گا تو ان کا کیا ہوگا؟۔ یونیورسٹی میں رہائشی سہولتوں کی کمی کے باوجود اگر طلبہ کسی طرح برداشت کر کے تعلیم حاصل کرلیں تو ان کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے۔

پروفیسر خسرو نے کبھی طلبہ کے ساتھ درشت یا سخت

یادِ رفتگاں

رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ نہایت خلیق اور شفیق تھے۔ انہوں نے اپنی خوش گفتاری، بلند اخلاقی، نرم مزاجی اور خوش خلقی سے تمام مسائل کی یکسوئی میں کامیابی حاصل کی۔

علی گڑھ میں اپنے حسنِ انتظام، تدبر، حلم، دانش اور بلند اخلاقی اور دلنوازی کی وجہ سے انہوں نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ آج بھی علی گڑھ میں ان کا نام نہایت محبت، عقیدت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے جو مقبولیت انہیں حاصل ہوئی، شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوئی ہو۔

علی گڑھ کے اسی دور میں جب دوبئی کے سربراہ مملکت شیخ زائد بن سلطان النھیان دہلی تشریف لائے تھے، پروفیسر خسرو نے فوراً دہلی کا سفر کیا اور خصوصی دعوت پر چند گھنٹوں کے لیے انہیں علی گڑھ بلا لائے۔ انہیں استقبالیہ دیا گیا۔ یونیورسٹی میں پٹرولیم انجینیر نگ کے شعبے کے قیام کی ضرورت اور اس کی تکمیل کے لیے مالی تعاون کی درخواست کی، جس کے نتیجے میں سلطان نے اسی وقت ایک کروڑ روپے کا مالی تعاون عطا کیا۔ ایک کروڑ روپے اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کیمیکل انجینیر نگ کا یہ کالج موجود ہے۔

پروفیسر علی محمد خسرو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کے علاوہ چانسلر بھی بنائے گئے۔ جولائی 1992 سے اگست 1995 تک وہ چانسلر رہے۔ انہوں نے سرسید کے اس گلشن اور ہندوستان میں قوم وملت کے اس سرمایہ کی ترقی، تحفظ اور استحکام کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر سید حامد کا تہذیب الاخلاق کے جنوری 2005 کے شمارے میں پروفیسر علی محمد خسرو پر ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے ملی تعلیمی بیداری مہم کے لیے پروفیسر خسرو کی خدمات اور مسلم یونیورسٹی کے استحکام اور تحفظ کے لیے ان کی خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ یونیورسٹی کے کاز کے لیے سابق وائس چانسلرز نے حکومت سے نمائندگی کی اور ان کی رائے کو حکومت نے اہمیت دی۔ اس مضمون میں انہوں نے بہت سے اپنے شخصی تجربات اور مشاہدات قلمبند کئے ہیں جن سے پروفیسر خسرو کی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشہور طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے کالم ''آدمی نامہ'' میں 1998 میں پروفیسر علی محمد خسرو پر ایک خاکہ لکھا تھا، جس میں انہوں نے پروفیسر خسرو کے ذاتی اوصاف و کمالات اور ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

پروفیسر علی محمد خسرو کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں خواجہ غلام السیدین یادگاری خطبہ کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقعہ پر انہوں نے اردو کی تہذیبی معنویت کے موضوع پر ایک یادگار لیکچر دیا تھا، جو میموریل ٹرسٹ کی جانب سے 1987 میں شائع ہوا۔ اس لیکچر کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر خسرو اردو زبان و ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا

مطالعہ وسیع تھا اور وہ اردو زبان و اہل زبان کی روشن خصوصیات سے کماحقہ واقف و آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنے اس لیکچر میں اردو زبان کی رواداری، سہل پسندی (اخذ وقبول کی صلاحیت)، اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے ثقافتی معیار، یکجہتی، بے تعصبی اور کشادہ دلی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اردو زبان کو عوامی مقبولیت اور عوام کی سرپرستی حاصل ہے۔

پروفیسر خسرو کا تعلق ایک متصوفانہ خاندان سے تھا، وہ ایک صوفی منش انسان تھے، انہوں نے اردو زبان پر تصوف کے اثرات کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اردو زبان پر عوامی تحریکوں اور اقدار کے اثرات کو نشان زد کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے باہمی ارتباط اور مستقبل کے امکانات کو پیش کیا ہے۔

پروفیسر علی محمد خسرو کو اردو شعر وادب سے گہرا شغف تھا۔ پروفیسر سید حامد نے بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ اپنی تقریر میں برمحل اشعار استعمال کا کمال رکھتے تھے۔ اپنی عام گفتگو میں بھی اردو کے معروف ہی نہیں بلکہ غیر معروف شعراء کے اشعار بھی اس طرح برمحل پیش کیا کرتے تھے کہ مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک جگہ انہوں نے مخدوم محی الدین سے اپنی دوستی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مخدوم نے اپنی زندگی کی آخری شام چند دوستوں کے ساتھ گزاری، جن میں مجھے بھی شریک ہونے کا فخر حاصل تھا۔ رات کے کوئی بارہ بجے محفل کو اس مضمون پر ختم کیا:

دوستو ہاتھ میں ہاتھ دو، سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی، منزلیں دار کی، کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو''

''اردو کی تہذیبی معنویت'' کے مطالعہ سے پروفیسر علی محمد خسرو کی بصیرت اور اردو زبان کے سلسلے میں ان کی فکرمندی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے کردار اور اس کی تہذیبی معنویت پر بڑی گہرائی سے روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان کے سیکولر کردار اور اس کے مزاج کی وسعت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آج بھی اس کتاب کی معنویت برقرار ہے۔

تدریسی، تنظیمی، انتظامی، سفارتی نوعیت کے کئی اعلیٰ عہدوں پر مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دینے کے باوجود پروفیسر علی محمد خسرو بذاتِ خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ قوم وملت کی خدمت کے لیے انہوں نے آپ کو وقف کردیا تھا۔ ایک بلند اخلاق انسان اور عظیم دانشور کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ان کی خدمات یادگار رہیں گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج
رائے چوٹی، آندھرا پردیش

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر محمد کاشف

منٹو: ایک بے باک خاکہ نگار

اُردو ادب میں منٹو کی شناخت اور شہرت اس کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہے۔ افسانہ کے علاوہ دوسرے نثری اصناف میں بھی اس نے اپنی تخلیقات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ناول، مزاحیہ مضامین، صوفیانہ تحریریں، ڈرامے اور خاکے لکھے ہیں۔ مجھے یہاں اس کی خاکہ نگاری سے بحث ہے۔ اس کے خاکوں کے دو مجموعے ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' شائع ہوئے ہیں۔ جن میں کل ملاکر 22 ادبی، صحافتی اور فلمی شخصیتوں پر خاکے لکھے گئے ہیں۔

خاکہ ایک قلمی تصویر کا فن ہے جس میں الفاظ کے ذریعہ شخصیت کے خارجی اور داخلی عناصر کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ شخصیت متحرک اور جاندار نظر آنے لگتی ہے۔ خاکہ میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں خاکہ نگار کا تأثر اور اس کی انفرادیت بھی موجود ہوتی ہے۔ تأثر کی وجہ سے خاکہ میں محدود تخیل کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ اس لیے مرقع کشی میں خاکہ نگار کو اس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا خاکہ اتنا تخیلی نہ ہو کہ وہ صرف تصور میں زندہ رہ سکے اور نہ اس قدر حقیقی ہو کہ نظروں تک ہی موجود رہے۔

خاکہ ایک کٹھن فن ہے جیسا کہ خلیق انجم صاحب کی رائے ہے۔ ان کے نزدیک اس کا کٹھن ہونا طویل مطالب کو مختصر کرنے میں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خاکہ کا فن اس وجہ سے مشکل فن ہے کہ خاکہ نویس کے لیے شخصیت کے بیان میں توازن قائم رکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ یہ بہت ممکن ہے اس کے ہاتھوں ایک معمولی شخصیت غیر معمولی بن جائے اور غیر معمولی انسان معمولی بن جائے۔ کیوں کہ یہاں شخصی رفاقتیں اور رقابتیں اپنا کام کرسکتی ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک اچھے خاکہ میں اعتدال وتوازن کا ہونا ضروری ہے۔

منٹو نے جن شخصیتوں پر خاکے لکھے ہیں ان کی زندگیوں کو اس نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع بھی اسے ملا تھا۔ سوائے اس خاکہ کے جو اس نے قائداعظم مسٹر جناح پر تحریر کیا۔ منٹو نے قائداعظم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ان کے ایک ملازم آزاد کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اپنے بیدار ذہن اور قوت مشاہدہ کے ذریعہ وہ ان کی ذاتی زندگی میں جھانکنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

منٹو نے مختلف واقعات کے ذریعہ مسٹر جناح کی زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے۔ بیوی کی جدائی اور بیٹی کا ان کی مرضی کے خلاف شادی کرنا ان باتوں نے انھیں جس کرب والم میں مبتلا کررکھا تھا ان تمام چیزوں سے ہم اس کے خاکے میں واقف ہوجاتے ہیں۔ چونکہ جناح کی سیاسی شخصیت اس قدر حاوی تھی کہ ان کی نجی زندگی پردوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ لیکن منٹو جیسے فنکار کی نظر پردوں کے پیچھے چھپی شخصیت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہ آزاد کے حوالے سے لکھتا ہے:

''جب پرانے کپڑوں کا صندوق کھولا جاتا تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے۔ایک دم ان کے دبلے پتلے اور شفاف چہرے پر غم واندوہ کی لکیروں کا جال سا بکھر جاتا۔''اٹ از آل رائٹ،اٹ از آل رائٹ'' کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونوکل اتارتے اور اسے پوچھتے ہوئے ایک طرف نکل جاتے''(منٹونما/سعادت حسن منٹو/ص:24)

منٹو کے اس خاکے کو پڑھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ قائداعظم جیسا ایک عظیم المرتبت شخص بھی اپنی نجی زندگی میں ایک عام آدمی جیسا نظر آتا ہے۔منٹو کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی شخصیتوں کو بھی انسانی زاویے سے دیکھتا ہے۔اس کی فطرت کے ان پہلوؤں پر اس کی نظر مرکوز ہوجاتی ہے جو اسے عام انسانوں جیسا بناتی ہیں۔

منٹو ایک بے درد حقیقت نگار تھا جیسا کہ اس کے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ صرف سچ یا حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے رسوا ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔خاکوں میں اس کی بے باک حقیقت نگار کا اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔منٹو مشرقی روایت کے اس اصول پر یقین نہیں رکھتا تھا جس میں مرنے کے بعد انسان کو صرف اس کے محاسن سے یاد کیا جائے اور عیوب کی پردہ پوشی کی جائے۔ اس بارے میں اپنے خیال کا اظہار اپنی کتاب ''گنجے فرشتے'' کے آخر میں کرتا ہے۔وہ لکھتا ہے:

''میں ایسی دنیا ایسے جندب سماج پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول روح ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے دھل دھلا کر لائے اور رحمۃ اللہ کے کھونٹی پر لٹکا دیا جائے''۔

(کلیات منٹو(منٹو کے خاکے)ص:40)

اسی مضمون میں آگے لکھتا ہے۔

''میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں،کوئی شیمپو نہیں،کوئی گھونگرو پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہوسکی۔اس کے منھ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہوسکتی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کرسکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔''

(کلیات منٹو/منٹو کے خاکے/ص:40

مذکورہ بالا اقتباسات سے خاکہ نویسی کے بارے میں منٹو کے تصورات واضح ہوجاتے ہیں۔اقتباس کو پڑھ کر بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے اپنے خاکے میں بڑی بے دردی سے انسانی عیوب کی پردہ دری کی ہے۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنی بے باک نگاری، حق گوئی، صداقت شعاری اور دیانت داری کے باوجود اپنے خاکے میں شخصیت کو منہدم نہیں کرتا ہے اور نا ہی کردار کشی کا مرتکب ہوا ہے اور نہ اپنے کردار کو ملمع سازی کرکے ایک icon کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ انسان کو اس کے فطری روپ میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ انسان میں جہاں اچھائیاں ہوتی ہیں وہیں وہ

یادِ رفتگاں

برائیوں کا بھی حامل ہوتا ہے۔منٹوشخصیت کے دونوں پہلوؤں کوفطری شکل میں پیش کرتا ہے۔وارث علوی لکھتے ہیں:

''عام خاکہ نویسوں کے برعکس منٹو کو نہ تو اس بات سے دلچسپی تھی کہ وہ اپنے کرداروں کی سماجی شخصیت کو تو پیش کرے نہ ہی اس بات میں کہ ان کی سماجی شخصیت میں کمی نکالے۔ادب،صحافت اور فلم کی زندگی میں آدمی جیسا ہے ویسا سامنے نہیں آتا بلکہ اس کا ایک امیج بن جاتا ہے' امیج کو پیش کرنا ماس میڈیا کا فنکشن رہا ہے اور شخصیت کو منہدم کرنا.....ان لوگوں کا وطیرہ رہا ہے جو بطور بت شکن صحافی اپنا امیج بنانا چاہتے ہیں.....منٹو ان دونوں قسم کے صحافیانہ رویے سے بلند تھا۔''(منٹوایک مطالعہ)

اپنے خاکے میں منٹوشخصیت کے متضاد پہلوؤں کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ منٹو جہاں شخصیت کے عیوب بیان کرتا ہے وہاں اس کا اسلوب اور اس کا رویہ ہمدردانہ اور رفیقانہ ہے۔شخصیت کے منفی پہلوؤں کا بیان ہمارے اندر اس شخص کے تئیں نفرت کا جذبہ پیدا نہیں کرتا ہے بلکہ ہمیں اس شخص سے ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ چونکہ ایک اچھے خاکے میں شخصیت کا دونوں پہلو کا ہمدردانہ اور فنکارانہ بیان ہوتا ہے۔یہی عناصر منٹو کے خاکوں کو اعلیٰ بناتی ہیں۔

منٹو کے خاکے میں جو کردار ملتے ہیں ان کا تعلق مختلف پیشے اور طبقے سے ہے۔یہاں صحافی اور ادیب بھی ہیں اور فلمی دنیا کے ستارے بھی۔فلمی دنیا کے کرداروں میں طوائف بھی شامل ہے۔فلمی دنیا کے جو کردار ان کی زندگی میں جس طرح کی اخلاقی باختگی،جنسی افراتفری اور انارکی پائی جاتی تھی۔ اسی زمانے میں جس کا منٹو خود بھی شاہد ہے ایسے کرداروں پر خاکہ نویسی کرنا اور ان سے متعلق واقعات کو بیان کرنے میں اپنی شخصیت کو جذبات سے الگ رکھنا اور غیر جانب دار ہوکر ایسی شخصیتوں کو پیش کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ منٹو ایسے کرداروں کی خاکہ نویسی بھی بڑے ہی بے اعتنائی اور استغنا کے ساتھ انجام دی ہے۔منٹو نہ تو واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور نہ ہی ان کی اخلاق سے گری ہوئی باتوں کو تمسخر اور استہزا سے پیش کرتا۔ان سے متعلق واقعات کو پیش کرنے میں ان کی اپنی ذات بالکل لاتعلق ہوتی ہے وہ اس کیمرہ کی طرح ہے جو واقعات کو ہوتا ہوا دیکھتا ہے لیکن اس میں ملوث نہیں ہوتا۔منٹو یکسوئی اور بے اعتنائی سے تمام حالات کو اتارتا جاتا ہے۔

بقول وارث علوی:

''ایک نظر سے دیکھیں تو منٹو کی زندگی ان کی زندگی نہیں تھی اس لیے نہ ان کی رقابت تھی نہ رشک وحسد،نہ ان کا رعب وداب تھا نہ ان کی مداحی،نہ تو انھیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے نہ ان کے قد کو کم کرتا ہے۔وہ جہاں بھی ہے اسی حال میں مست ہے۔وہ آرام سے کسی بھی جذباتی خلفشار کا شکار ہوئے بغیر لب تماشا دیکھ سکتا ہے۔بے بروہال سے پیدا شدہ آرام یا ذہنی یکسوئی کی اس کیفیت نے اس کے یہ خاکے لکھوائے ہیں۔'' (منٹو:ایک مطالعہ/ص:114)

منٹو شخصیت کے متضاد پہلوؤں کی عکاسی میں طنز کا بھی استعمال کرتا ہے لیکن اس کے طنز میں ہمدردی دردمندی ہوتی ہے اس لیے منٹو کے یہاں برے سے برا آدمی گھٹیا نظر نہیں آتا مگر آدمی ضرور دکھائی دیتا ہے۔ فلمی ہیروئن پر اس کا ایک خاکہ ''پری چہرہ نسیم'' ہے۔ نسیم کا حسن میک اپ کے ساتھ پارٹی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس کی شخصیت پارٹی میں پُرعظمت اور باوقار نظر آتی ہے۔ دوسری طرف یہی نسیم اپنے گھر پر ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ شخصیت کے اس دہرے پن کے بیان میں کہیں نفرت وحقارت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہیروئن کے معمول پن کے اظہار میں منٹو کی انسانیت جھلکتی ہے۔

''نسیم نے آہستہ آہستہ شب خوابی کا لباس پہنا، چہرہ کا میک اپ اتارا تو صفیہ نے حسرت زدہ ہوکر کہا ''ہائے تم کتنی پیلی ہو نسیم''، نسیم کے پچکے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتی یہ سب میک اپ کی کارستانی ہے۔'' (کلیات منٹو: منٹو کے خاکے/ص:185)

منٹو نسیم کے حسن اور اس کی خوبصورتی کو اس کی معصومیت اور سادگی میں دکھایا ہے گویا اس خاکے کا تبسم، حسن اور انسانیت ہے۔ منٹو نے ایک دوسرے خاکہ ''پارو دیوی'' میں ایک طوائف کا نقشہ پیش کیا ہے۔ کردار کے طوائف ہونے کے باوجود منٹو کو اس کی شخصیت میں دوسرے اچھے اور صاف کی موجودگی زیادہ زیادہ پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ منٹو عورت کا احترام کرتا ہے۔ چاہے وہ طوائف کیوں نہ ہو۔ اس میں احترام کا جذبہ اس کی انسانیت کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک ایک طوائف جسم فروشی کے باوجود صاف باطن، خوش اطوار اور دل کی اچھی ہوسکتی ہے۔ شخصیت کے انہی پہلوؤں کی طرف اس خاکہ میں اس کی نظر جاتی ہے۔

''جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں، پارو بہت ہنس مکھ گھلو مٹھو ہوجانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن سے وہ اونچ نیچ سے بے پرواہ ہوکر بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں مقبول ہوگئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کردیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات میں پارو کے بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔ پارو میں عام طوائفوں میں جیسا بھڑکیلا پن اور چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر گفتگو کرسکتی تھی۔'' (منٹو نما/ سعادت حسن منٹو/ص:366)

منٹو فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ وہاں اس نے ہر طرح کے جنسی اسکینڈل دیکھے۔ اس کے تعلقات ایسے لوگوں سے بھی تھے جن کا مقصد ہی جنسی جذبات کی تسکین تھا۔ ایسے لوگ اتنے زیادہ جنس زدہ تھے کہ منٹو جیسا آزاد خیال فنکار بھی انھیں شاید ہی ہضم کرسکے۔ اس طرح کے کردار پر دو خاکے ہیں۔ ''ستارہ'' اور ''رفیق غزنوی'' ان دونوں خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں منٹو نے گہری نفسیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔ خاکے میں منٹو نے اپنے کرداروں جنسی مہمات کے علاوہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے نفسیاتی عوامل کو بھی اجاگر کیا ہے۔

یادِ رفتگاں

منٹو کے انداز بیان میں غیر جانب داری اور ہمدردی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ منٹو کی باریک بینی اور نفسیاتی ژرف نگاہی ان خاکوں کو سطحیت پر آنے سے بچالیتی ہے۔

ادیبوں میں میراجی پر اس کا خاکہ ''تین گولے'' منٹو کی فلسفیانہ ژرف نگاہی اور فنکارانہ بصیرت کی عمدہ مثال ہے۔ حسن و عشق اور موت کی تثلیث کے استعاروں کے حوالے سے میراجی کی پراسرار شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اس خاکے کے ایک جملے ''اچھا ہوا کہ وہ جلدی مرگیا۔ کیوں کہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں'' سے بظاہر منٹو کی انسانیت ڈگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بقول عابد علی عابد:

''بظاہر ان فقروں سے سنگدلی ٹپکتی ہے لیکن ان کے بین السطور پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ منٹو کا دل رحم سے جیسے بھر آیا۔ وہ میراجی جیسے انسان کی مزید ذلت برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے اسی کے مرنے پر اچھا ہوا کے کلمات استعمال کرتا ہے۔'' (نقوش منٹو نمبر/ص:278)

جہاں تک منٹو کے اسلوب کا تعلق ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا اسلوب خاکے میں افسانے کے اسلوب سے متأثر ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہے اس لیے اس کے خاکے میں افسانہ نگاری کے اسلوب کی کارفرمائی فطری ہے۔ افسانوی اسلوب کے اثرات صرف تأثرات اور مشاہدات کی تربیت و تشکیل میں ہی نہیں بلکہ شخصیت کے خارجی اور داخلی عناصر میں ربط پیدا کرنے میں بھی ایسے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی کردار کو بھی ابھارنے کے لیے ضمنی کرداروں سے فائدہ اٹھانے میں اور جزئیات و تفصیلات کے انتخاب میں احتیاط سے افسانوی اثرات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

بقول نظیر احمد صدیقی:

''گنجے فرشتے کے مضامین میں منٹو اپنی افسانہ نویسی پر قدرت نفسیاتی بصیرت اور فنکارانہ ہمدردی و بے رحمی جیسے ان تمام عناصر کو بڑے سلیقے سے بروئے کار لائے ہیں۔''
(سعادت حسن منٹو ایک لجنڈ/مرتبہ ہمایوں اشرف/)

اس طرح سے منٹو کی خاکہ نگاری بے رحم لیکن ہمدردانہ صداقت اور نفسیاتی بصیرت اور ژرف نگاہی کا بے مثال نمونہ ہے۔ منٹو نے اپنے خاکے کے ذریعے نہ صرف اردو خاکہ نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا بلکہ اپنے فنکارانہ مرقع نگاری سے کئی گمنام شخصیتوں کو قعر گمنامی سے نکال کر زندہ جاوید کردیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد کاشف
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد 046 500

جس شخص پر نصیحت اثر نہ کرے
وہ سمجھ لے کہ
اس کا دل ایمان سے خالی ہے
(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

محمد آصف علی
ریسرچ اسکالر

فصیح الملک بہادر داغؔ: دلی، رامپور اور حیدرآباد دکن

نواب مرزا خان داغؔ دہلوی۔ 1830ء میں دلی میں پیدا ہوئے، چاندنی چوک کا یہ علاقہ آج کوچۂ استاد داغ کہلاتا ہے۔ نواب شمس الدین خان احمد خان والی فیروز پور والد تھے۔ جبکہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم داغ کی والدہ تھیں۔ سن پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے، کسی نے 1830ء تحریر کیا ہے تو کسی نے 1831ء مستند مانا ہے۔ ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنی مرتبہ کتاب ''داغؔ دہلوی۔ حیات اور کارنامے'' میں تاریخ پیدائش 25/مئی 1831ء دی ہے جبکہ گلزار دہلوی نے اپنے مضمون 'داغؔ اور اُن کے دہلوی شاگرد' میں صرف سن پیدائش پر اکتفا کیا ہے اور انہوں نے 1830ء سن پیدائش درج کی ہے۔ بہرحال چونکہ ڈاکٹر کامل قریشی 9، اور 10 فروری 1975ء کو اُردو اکیڈیمی دہلی کی جانب سے داغؔ پر منعقد کئے گئے دوروزہ سیمینار کے ڈائریکٹر تھے اُردو کے ممتاز محققین اور ناقدین سے انہوں نے داغؔ کی سوانح، شخصیت اور فن پر مقالے بھی لکھوائے ہیں، اُن کی تحقیق پر سوال انہیں اٹھائے جاسکتے۔ اُنہوں نے 25 مئی تاریخ بھی سن کے ساتھ پیش کی ہے یہی مستند تاریخ مانی جائے گی۔ داغ کے والد کے بارے میں بھی کسی تحقیق میں والیٔ لوہارو دیا گیا ہے تو کسی تحقیق میں والیٔ فیروز پور جھرکہ، تاہم اس بات کی ضرور تصدیق ہوئی ہے کہ کرنل فریزر کے قتل کے جرم میں ملوث قرار دیئے جانے پر انہیں پھانسی دی گئی اور اس وقت داغ کی عمر 4یا5 سال بتائی گئی۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد چھوٹی بیگم نے تقریباً 1844ء میں بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد، مرزا فخرو سے نکاح کرلیا اور داغ کے ساتھ لال قلعہ منتقل ہوئیں، مخمور سعیدی نے اپنی تحقیق میں نواب شمس الدین احمد خان کو والیٔ فیروز پور جھرکہ ہی تحریر کیا ہے۔ جبکہ ''لوہارو'' کا علاقہ ان کے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد خان کے حصے میں آنے کی بات کہی ہے جو درست معلوم ہوتی ہے۔

مخمور سعیدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ نواب امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد کی عمریں اپنے والد کے انتقال کے وقت بالترتیب گیارہ اور چار سال تھیں، یہی وجہ ہے کہ نواب شمس الدین والی لوہارو بھی بن بیٹھے تھے، تاہم دلی کے ریزیڈنٹ ولیم فریزر کی مداخلت کے بعد وہ لوہارو سے دستبردار ہوئے اور والیٔ فیروز پور جھرکہ کے طور پر ہی انہیں قبول کیا گیا۔ جبکہ 'لوہارو' نواب امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد کے تصرف میں چلا گیا۔ داغؔ کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا وہ جو انہوں نے دلی میں گذارا، دوسرا وہ جو رامپور میں اور تیسرا وہ جو آخر تک حیدرآباد دکن میں گذارا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ داغؔ کی والدہ کی جانب سے

یادِ رفتگاں

مرزا فخرو سے نکاح کئے جانے اور قلعہ منتقلی کے بعد داغؔ کی پرورش، تعلیم وتربیت دیگر شہزادوں کے ساتھ قلعہ ہی میں ہوئی۔اس وقت داغؔ کی عمر 13 یا 14 تھی جب ان کی تربیت کا نظم خود مرزا فخرو نے اپنی جانب سے کروایا۔ داغؔ کی تعلیم وتربیت کے بارے میں سعید مخموری لکھتے ہیں۔:

''داغؔ نے مرزا غلام حسن شکیبا' شاگردِ میر تقی میرؔ کے بیٹے مولوی سید احمد حسین دہلوی سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں، میر پنجہ کش دہلوی سے خوش نویسی کے فن، مرزا عبداللہ بیگ سے بانک، مرزا سنگی بیگ سے پھسیکتی، سجن اور بندو خان سے گھوڑسواری کی تربیت حاصل کی۔ تیراندازی، چورنگ، اور بندوق چلانا داغ کو خود مرزا فخرو نے سکھایا۔ شاعری میں بھی داغؔ کے پہلے استاد مرزا فخرو ہی تھے، خود داغؔ کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنی کچھ ابتدائی غزلوں پر مرزا فخرو سے باقاعدہ اصلاح لی تھی۔ پھر انہی کے مشورے پر ذوقؔ کے شاگرد ہوئے، داغؔ پہلے مرزا تخلص کرتے تھے، داغؔ تخلص بھی مرزا فخرو ہی نے دیا۔''

داغؔ جب 25 سال کی عمر کو پہونچے تو مرزا فخرو کا انتقال 1856ء میں ہوا، جس کے بعد وہ اپنی والدہ اور مرزا فخرو سے جو اولادیں چھوٹی بیگم کو ہوئی تھیں ان کے ہمراہ دوبارہ دلی میں واقع اپنے مکان واپس ہوئے، لیکن 1857ء کے غدر نے داغؔ کی دنیا ہی اُجاڑ دی تھی۔ایک جانب جہاں داغ کی والدہ کا وظیفہ بند ہوا، وہیں دوسری جانب دلی میں افراتفری پھیلی تھی جس کے بعد داغؔ نے رامپور کا رخ کیا جو اُن کی زندگی کا دوسرا حصہ کہا جاسکتا ہے۔ داغؔ کی شادی اپنی خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم سے اس وقت ہوگئی تھی جب وہ 15 برس کے تھے اور قلعہ میں ہی اپنی سکونت برقرار تھی۔ 1857ء ہی میں داغ رامپور منتقل ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''داغؔ کی شخصیت اور سیرت'' میں کچھ یوں لکھا ہے:

''1857ء کے ناکام انقلاب کے دوران داغؔ اپنی والدہ چھوٹی بیگم، خالہ عمدہ بیگم، اور سوتیلے بھائیوں آغا مرزا شاغلؔ، اور خورشید عالم کے ساتھ دہلی سے نکلے، کچھ روز آنولے میں حکیم ولایت کے پاس رہے اور پھر اکتوبر یا نومبر 1857ء میں رامپور پہونچ گئے۔ 1857ء سے 1866ء تک داغ رامپور میں رہے۔''

داغؔ جس وقت رامپور منتقل ہوئے اس وقت غدر کے سبب دہلی اور لکھنؤ پوری طرح اجڑ چکے تھے بالخصوص شعر و سخن کی آبیاری کرنے والوں نے اپنے آب ودانے کے لئے نقل مکانی شروع کردی تھی، اور علوم وفنون کی سرپرستی کرنے والا بھی کوئی بچا نہیں تھا۔ داغؔ نے کتنے سال رامپور میں گذارے اس کو لے کر تضاد پایا جاتا ہے۔کسی نے 12 سال تحریر کیا ہے اور کسی نے اسی مدت کو 19 سال پر اکتفا کیا ہے، بہرحال رام پور میں قیام کے دوران نواب کلب علی خان نے داغؔ کو اپنے زمرے مصاحبین میں تقرر کیا تھا، یہی نہیں بلکہ نواب کلب علی خان نے اپنے دور میں رامپور کو ایک اہم ادبی اور فنی مرکز بھی بنایا تھا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم

کچھ اس طرح رقمطراز ہیں۔:

''دہلی اور لکھنؤ اُجڑ چکے تھے۔ نواب یوسف علی خان ناظم اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خان دونوں خود شاعر اور ادیب تھے اور مختلف فنون کے سرپرست تھے، اس لئے رام پور ایک اہم ادبی اور ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ عربی فارسی اُردو کے عالم، فاضل، شاعر، ادیب اور فرہنگ نگار اس شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ مختلف فنون کے ماہرین نے یہیں پناہ لے رکھی تھی۔ منشی احمد حسن خان عروجؔ، امیر احمد امیرؔ مینائی، امیر اللہ تسلیمؔ، حسین علی خان شاداںؔ، سید ضامن علی جلالیؔ، شیخ امداد علی بحرؔ، منشی سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی اور منشی مظفر علی اسیرؔ وغیرہ جیسے شاعروں نے رام پور کو رشکِ دلی اور لکھنؤ بنا رکھا تھا۔ شہر اور دربار میں طرحی مشاعرے ہوتے تھے جن کی وجہ سے شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا۔''

نواب کلب علی خان کے ہمراہ ہی داغؔ نے کلکتے کا سفر کیا تھا اور حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ داغؔ اور رامپور کا رشتہ پرانا بھی تھا اور مضبوط بھی۔ داغؔ کی خالہ عمدہ بیگم، نواب یوسف علی خان کے قیامِ دلی سے ان سے وابستہ تھیں اور جب وہ رامپور منتقل ہوئے تو عمدہ بیگم اور داغؔ بھی رامپور پہونچے تھے۔ غالباً اس وقت داغؔ کی عمر نو سال بتائی گئی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب داغ پہلی مرتبہ رامپور پہونچے تھے، لیکن دلی اُجڑنے کے بعد جب وہ 1857ء میں رامپور پہونچے تھے تب ان کی عمر لگ بھگ 26 یا 27 سال رہی ہوگی۔ کلکتے کے سفر اور حج بیت اللہ کی روانگی کے سلسلے میں خود داغؔ نے اپنے اشعار میں اظہار خیال کیا ہے جسے مخمور سعیدی نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی ادب کے معمار۔ داغؔ دہلوی۔'' میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دسمبر 1866ء میں نواب صاحب کے کلکتے کے سفر میں داغ اُن کے ہمرکاب تھے اور 1872ء میں جب نواب صاحب حج بیت اللہ کو گئے تو ان کے ساتھ داغؔ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ گلزارِ داغؔ (طبع اول) کے صفحہ نمبر 111 پر درج ایک غزل کے مقطعے میں داغؔ کہتے ہیں۔

''یہ سنا جو حضرت داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے، یہی فکر ہے، شب و روز عزمِ سفر سے خوش

کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر انہوں نے ایک غزل کہی جس کا انداز حمدیہ ہے، اس غزل کے چند شعر یہ ہیں:

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو
بے غرض جو دیا، دیا تو نے
تھا مرا منہ نہ قابلِ لبیک
کعبہ مجھ کو دکھا دیا تو نے
داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

یادِ رفتگاں

داغؔ دہلوی رام پور میں بھی دلی کی طرح شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ رہے اور نواب کلب علی خان کی جانب سے مقرر کردہ وظیفے کے علاوہ جیب خاص سے بھی انہیں عطا کیا جاتا تھا اور رامپور میں قیام کے دوران کئی بار دلی جانے کا بھی اتفاق ہوا، جس کا انہوں نے اپنے روزنامچے میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں داغؔ نے رامپور کے قیام اور وہاں کے گوناگوں تجربات کے متعلق روزنامچے میں جو تحریر کروایا تھا، اسے ڈاکٹر محمد علی زیدی نے اپنی تحقیق ''مطالعہ داغؔ'' میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی خان نے روزنامچے کی تحریر کا حوالہ 'بزمِ داغؔ'' سے لیا ہے۔ جس میں داغؔ لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی میں جس قدر تجربات رامپور کے زمانہء قیام میں حاصل کئے کبھی نہیں کئے۔ رامپور نے میری زندگی کو سانچے میں ڈھال دیا اور میرے سارے کس بل نکال دیئے۔''

داغؔ نے اپنے قیام رامپور کے دوران دلی کے علاوہ بریلی، شاہجہاں پور، آگرہ، بھوپال، امرتسر و دیگر مقامات کا بھی سفر کیا۔ تاہم کلکتہ کا سفر خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے جس کی ایک وجہ ڈیرے دار طوائف منی بائی حجابؔ سے ملاقات بھی تھی۔ دہلی، کانپور، لکھنؤ، الہ آباد، اور پٹنہ ہوتے ہوئے وہ کلکتہ پہونچتے تھے اور وہ جہاں بھی قیام کرتے، ان کی زبردست پذیرائی ہوتی، ان کے خیر مقدم میں مشاعرے منعقد کئے گئے، جس میں انہوں نے خود شرکت کی اور اپنا کلام بھی سنایا۔ منی بائی حجابؔ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی چلا۔ بزم آرائیاں بھی ہوئیں اور شعر و سخن کی محفلیں بھی آراستہ ہوئیں۔ کلکتہ میں ان کا قیام تقریباً ایک ماہ رہا اور نواب کلب علی خان کی طلبی پر وہ دوبارہ رامپور پہونچے۔ نواب کلب علی خان کی اچانک موت نے داغؔ کو مایوس کر دیا اور ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے لکھا ہے:

'' نواب کلب علی خان کا انتقال (23/مارچ 1887ء) رامپور کی دنیائے ادب کے لئے عموماً اور داغؔ کے لئے خصوصاً ایک حادثہ عظیم تھا۔ نواب کی بے ہنگام موت سے داغؔ کی تمام امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ رامپور کی آراستہ محفلِ ادب منتشر ہوگئی۔ داغؔ بھی 28 دسمبر 1887ء کو استعفیٰ دے کر رامپور چھوڑ کر چلے گئے۔ داغؔ نے اس حادثے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کئی جگہ کیا ہے۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے:

نواب نے کی جو قدردانی میری
اے داغؔ گذر گئی جوانی میری
لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقتِ پیری
مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

رامپور ہی میں رہنے کے دوران داغؔ کا چرچا ہندوستان بھر میں ہو چلا تھا اور جیسے ہی انہوں نے رامپور کو خیر آباد کہا، اور دلی واپس ہوئے، کئی مقامات سے انہیں بلاوا آنے لگا۔ بالخصوص حیدرآباد دکن میں اس وقت نظام الملک آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علی خان کی فرمانروائی تھی اور اہلِ علم و ہنر حیدرآباد دکن کی طرف کوچ کر رہے تھے۔

تمکین کاظمی نے اپنی تحقیق میں جہاں دلی اور رامپور میں گذارے ہوئے دنوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں داغؔ کے سفرِ دکن اور دکن میں قیام کے بارے میں بھی انہوں نے حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ داغؔ نے جملہ 30 برس رامپور میں گذارے ہیں۔ داغؔ حیدرآباد دکن دومرتبہ آئے تھے اور دوسری مرتبہ انہوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ تمکین کاظمی نے لکھا ہے کہ:

''جب ہر طرف سے نا اُمیدی ہونے لگی اور دلی میں رہنے کی بھی کوئی صورت نہ بنی تو داغؔ نے دکن کا رخ کیا۔ 7/اپریل 1888ء مطابق 24/رجب 1305ء کو حیدرآباد پہونچے اور سّدی عنبر بازار میں سیف الحق ادیب کے مہمان ہوئے۔''

محترمہ سیدہ جعفر نے بھی اپنے مضمون 'داغؔ کا قیامِ حیدرآباد' میں اس سلسلے میں تفصیل بتائی ہے۔ وہ تحریر کرتی ہیں:

'' نثار علی شہرتؔ اور سیف الحق دہلوی ادیب کی خواہش تھی کہ داغ حیدرآباد آکر قسمت آزمائی کریں۔ انہوں نے بعض ارکانِ ریاست سے مشورے کے بعد داغؔ کو خط لکھا تھا کہ وہ حیدرآباد چلے آئیں۔ چنانچہ 7/اپریل 1888ء کو مطابق 24/رجب 1305ھ کو داغؔ حیدرآباد پہونچے اور بازار سدی عنبر میں قیام کیا۔ داغؔ کا مکان سیف الحق دہلوی ادیب، مترجم اخبارات سرکاری کے گھر کے قریب تھا اور داغؔ ان کے مہمان ہوئے تھے۔''

سیف الحق دہلوی، داغؔ کے پرانے دوست تھے اور دونوں میں خط و کتاب کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا، حیدرآباد دکن پہونچنے کے بعد سیف الحق نے داغؔ کا تعارف حیدرآباد کے معزز طبقے سے کروایا اور وہیں ادبی حلقوں سے واقفیت بھی دلوائی جس کے چند ہی روز میں داغ حیدرآباد دکن میں مقبول ہوگئے، تاہم داغ چونکہ شاہانہ زندگی گذار چکے تھے، وہ حضور نظام سادس نواب محبوب علی خان کے دربار میں باریابی کے متمنی تھے اور اسی سلسلے میں انہوں نے کئی کوششیں بھی کیں، لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ایک مرتبہ حاجی محمد ابراہیم خانساماں شاہی کے توسط سے راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ سے ملاقات ہوئی اور اپنے قصیدے کے ساتھ نظام کے دربار میں بھی پیش ہوئے تھے، مگر بات نہ بنی تھی، حالانکہ حضور نظام نے اس وقت داغؔ کو سرفراز فرمانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ داغؔ نے مسلسل سوا سال حیدرآباد دکن میں رہنے کے بعد دوبارہ دلی کا رخ کیا۔ حیدرآباد دکن کے دوسرے سفر کے بارے میں تمکین کاظمی لکھتے ہیں۔:

''23/مارچ 1890ء کو یکم شعبان 1307ھ تھا اور داغ نے 7 شعبان تاریخ روانگی مقرر کی تھی اس دن ہفتہ تھا اور 29/مارچ غالباً انہیں روپیہ وقت پر مل گیا اور حسب قرار داد 7/شعبان مطابق 29/مارچ کو دہلی سے نکل کر تیسری یا چوتھی اپریل کو حیدرآباد پہونچ گئے۔ اب کی بار داغؔ نے محلّہ افضل گنج میں محبوب گنج کے کونے پر مولوی ظہور علی وکیل ساکن اٹاوہ کے مکان کے بازو (برابر) والے مکان میں مستقل طور پر قیام کیا۔''

یادِ رفتگاں

داغؔ حیدرآباد کودوسری مرتبہ جوآئے تھے وہ بالخصوص حضور نظام سادس کی جانب سے بھیجے گئے پیام کے بعد آئے تھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون میں تفصیل پیش کی ہے،وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

''شاہِ دکن میر محبوب علی خان پر داغؔ کی شاعری کا جادو چل گیا تھا۔تزک محبوبیہ (جلد دوم) سے پتہ چلتا ہے کہ نواب داور الملک بہادر کے ذریعہ سے انہوں نے داغؔ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی اور دس ماہ بعد داغؔ واپس ہوئے تھے۔''

نواب میر محبوب علی خان بہادر آصفجاہ کو شاعری سے شغف تھا،اکثر فکرِ سخن میں محور ہتے تھے،تاہم مصاحبین میں کوئی ایسا نہ تھا جوان کی شاعری کی اصلاح کر سکے۔یہی وجہ تھی کہ انہیں ایک استاد کی ضرورت درپیش ہوئی اور نواب میر محبوب علی خان نے اپنے کلام کی اِصلاح داغ سے لینی شروع کی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مطابق 1891ء میں میر محبوب علی خان نظام ششم نے داغؔ کی خدمت میں اپنی پہلی غزل اِصلاح کے لئے ارسال کی۔ غالباً 6رفروری اتوار کی شب 9 بجے چوب دار ایک سر بمہر لفافے میں غزل لے کر حاضر ہوا اور صبح دربار میں پہونچنے کی خبر بھی دی تھی۔میر محبوب علی خان کی مسند کے قریب مخصوص امرائے عظام اور چند خاص عہدیداروں کی نشستوں کے درمیان داغ کی نشست رکھی گئی تھی۔داغؔ کی اُستادی کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:۔

''داغؔ کو چودہ پندرہ برس تک سلطانِ وقت کی اُستادی کا شرف حاصل رہا اور وہ آصف جاہ سادس کے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔میر محبوب علی خان نظام ششم شاعر تھے اوران کا تخلص آصف تھا۔ان کے کلام میں اکثر جگہ اپنے اُستاد داغ سے اثر پذیری جھلک گئی ہے۔کلامِ آصف میں محاورہ اور روزمرہ کا برجستہ استعمال،عاشقانہ مضامین اور رنگین خیالی داغؔ کا فیضان معلوم ہوتی ہے۔ اپنی سیاسی مصروفیت کے باوجود آصف سادس نے شعر گوئی کا مشغلہ جاری رکھا تھا۔نوح ناروی سے داغؔ نے کہا تھا کہ بادشاہوں کے اشعار کی اِصلاح کے آداب یہ ہیں کہ دستِ مبارک سے تحریر کے ہوئے الفاظ قلم زد نہیں کئے جاتے بلکہ ان پر اصلاحی لفظ یا مصرعہ لکھدیا جاتا ہے۔''

نواب محبوب علی خان کی دریا دلی دیکھئے کی جب داغؔ کا تقرر ہوا تو شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ داغؔ جب سے حیدرآباد میں قیام کئے ہوئے ہیں،اُنہیں اس مدت کا بقایا بھی جاری کیا جائے۔جبکہ فرمان کے مطابق چارسو پچاس روپیہ حالی ان کی تنخواہ مقرر کی گئی،اس طرح داغؔ کی تنگ دستی بھی دور ہوئی کیونکہ دلی سے انہوں نے اپنا مکان فروخت کرتے ہوئے حیدرآباد کی راہ لی تھا اور جوجمع پونجی تھی وہ بھی خرچ ہو چکی تھی۔ تمکین کاظمی نے داغؔ کو حاصل ہوئے پہلے بقایا کے بارے میں اپنی تحقیق میں تفصیل دی ہے اور یہ حوالہ دیا ہے کہ جس وقت خزانہ عامرہ سے رقم کی تھیلیاں بنڈی میں ڈال کر لائی گئیں،ان کے والد مرحوم تجلّی، داغؔ کے پاس ہی بیٹھے تھے اوران تھیلیوں کو دیکھنے کے بعد داغؔ کی عجیب حالت ہوگئی

اور جسم میں رعشہ سا محسوس ہونے لگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''داغؔ کو پہلا بقایا ساڑھے تین سال کا بحساب ساڑھے چار سو روپئے ماہوار مبلغ اٹھارہ ہزار نو سو روپئے نقد ایصال طلب تھا جس میں سے پیشگی ایصال شدہ پندرہ سو روپیہ وضع کر کے مبلغ سترہ ہزار چار سو روپیہ نقد ادا کیا گیا۔''

آصف جاہی دربار سے داغؔ کو کئی اعزازت اور خطابات سے بھی نوازا گیا، منصب بھی دیا گیا، گاوں بھی عنایت کیا گیا اور ایک باغ بھی مرحمت فرمایا گیا تھا۔ خطابات دینے کے بعد حضور نظام نے داغ کی تنخواہ کو دوگنا کرنے کا فرمان جاری کیا اور ماہوار ایک ہزار روپئے تنخواہ مقرر کی گئی، خاص بات یہ رہی کہ دربار آصفجاہی سے بیک وقت کئی خطابات داغ کو عطا کئے گئے جو نادر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں تمکین کاظمی یوں رقمطراز ہیں۔:

''1312ھ مطابق 1894ء میں حضور کی سالگرہ تقریب میں خطابات سرفراز ہوئے اور داغؔ بُلبُل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک نواب مرزا خان بہادر ہو گئے۔ شایانِ مغلیہ اور آصفیہ کا یہ دستور تھا کہ پہلے خانی اور بہادری کا خطاب سرفراز کرتے پھر جنگی خطاب اس کے بعد دولہ اور اس کے بعد ملک کا خطاب سرفراز ہوتا تھا مگر بعض خاص اور ممتاز لوگوں کے لئے یہ ترتیب نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ساتھ پورے خطابات سرفراز ہوتے تھے۔ چنانچہ خوش قسمتی سے داغؔ کو بھی اسی طرح ایک ساتھ پورے خطابات سے معزز و مفتخر کیا گیا۔''

داغؔ دہلوی دربارِ آصفجاہی سے کئی خطابات سے سرفراز ہوئے لیکن وہ اپنی دستخطوں کے لئے صرف فصیح الملک، کا ہی استعمال کرتے تھے اور باضابطہ اس کی مہر عقیق پر کندہ کروالی تھی، حیدرآباد میں داغؔ کا قیام کم وبیش سترہ سال رہا لیکن انہوں نے اپنے لئے کوئی مکان تعمیر نہیں کروایا۔ انہیں سرکار عالی سے امید تھی کہ کوئی سرکاری عمارت تحفے میں دی جائے۔ اس غرض سے انہوں نے کئی بار اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا اور شاہی فرمان بھی جاری ہوا، مگر تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ندی کے اس پار چونکہ سرکاری عمارتیں کم تھیں یہی وجہ ہے کہ انہیں کوئی مکان یا عمارت الاٹ نہیں ہوسکی۔ بالآخر داغؔ نے ترپ بازار میں ایک عمارت کرائے پر حاصل کی جو کافی کشادہ اور وضع دار تھی۔ داغؔ نے اپنی تنخواہ مقرر ہونے کے بعد اپنی اہلیہ کو دلی سے طلب کرلیا تھا اور وہ ان کے ساتھ ہی رہنے لگی تھیں۔ چونکہ داغؔ لاولد تھے انہوں نے اپنی اہلیہ فاطمہ بیگم کی منجھلی بہن اولیا بیگم کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لیا تھا، بعض اصحاب نے لکھا کہ داغؔ کو اولاد نرینہ تو ہوئی لیکن بچپن ہی میں انتقال ہوا۔ بہرحال اپنی اہلیہ کے ساتھ انہوں نے اپنی لے پالک لاڈلی بیگم کو بھی حیدرآباد بلا لیا تھا، جب لاڈلی بیگم کے پہلے شوہر نواب ممتاز الدین احمد خان کا انتقال ہوا، تب داغؔ نے لاڈلی بیگم کی شادی سراج الدین احمد خان سائل سے کردی جو آگے چل کر داغؔ کے جانشین بھی کہلائے، مخمور سعیدی نے اپنی کتاب 'داغؔ دہلوی' میں لکھا ہے۔:

''داغؔ حیدرآباد اکیلے گئے تھے لیکن 6/فروری

یادِ رفتگاں

1891ء کو وہ ملازم سرکار ہو گئے تو انہوں نے اپنی بیوی فاطمہ بیگم کو بھی حیدرآباد بلالیا۔ فاطمہ بیگم نومبر یا دسمبر کے مہینے میں حیدرآباد پہونچیں۔ داغؔ شاہد ان بازاری سے اپنے بے پناہ شغف کے باوجود بیوی سے محبت کرتے تھے۔ داغؔ کے اس کرّ وفر کے زمانے میں وہ تقریباً ساڑھے سات سال داغؔ کے ساتھ رہیں اور دسمبر 1898ء میں ان کا انتقال ہو گیا، جس کا داغؔ نے ہفتوں سوگ منایا۔''

دنیائے شعروادب میں داغؔ ایک شاعرِ عاشق کے نام سے جانے جاتے تھے جبکہ ان کی شوخی اور چلبلا پن ان کی شاعری میں ایک اہم عنصر ہے، داغؔ کا عشقیہ شاعری میں اپنا ایک مقام ہے، وہ اپنی شاعری میں اپنے تجربات کی بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے اپنے تحقیقی مضمون ''داغؔ کی شاعری میں دل کے نور کا ظہور'' میں ایسی بیشتر مثالیں دی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ داغؔ عشقیہ شاعری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ مذکورہ مضمون غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ ایک روزہ سیمینار میں پیش کیا گیا تھا جسے بعد میں کو کتابی شکل میں شاہد ماہلی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر زینت اللہ جاوید یوں رقمطراز ہیں۔:

''داغؔ کے اسلوب اور زبان و بیان کی جب تعریف کی گئی ان کے روزمرہ اور محاورات کا جہاں کہیں حوالہ دیا گیا وہ بیشتر ایسی تخلیقات ہیں جن میں حسن و عشق کے معاملات کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ سادگیِ زبان کا حسن جہاں مرصع کاری کو ماند کر دیتا ہے لیکن ان کی فکریہ شاعری میں کہیں آورد یا لفظوں کے شعوری استعمال کا پتہ نہیں چلتا۔''

آگے اپنے مضمون میں محترمہ نے داغؔ کے اس شعر کا بھی حوالہ دیا:

ہم سناتے جو کوئی درد ہمارا سنتا
دل دکھاتے جو کوئی دیکھنے والا ہوتا

حیدرآباد میں ملازم ہونے کے بعد داغؔ نے ایک کاتب کو ملازم رکھتے ہوئے اپنا دیوان ترتیب دینا شروع کیا جس کا عنوان 'مہتابِ داغؔ' دیا گیا تھا۔ مذکورہ دیوان تقریباً ایک سال کے عرصے میں پورا ہوا جس کے بعد ''مطبع عزیز دکن'' چھتہ بازار میں اس کی طباعت ہوئی۔ داغؔ ایسے پہلے شاعر تھے جنہوں نے باضابطہ ایک کاتب کو ملازم رکھتے ہوئے اپنی نگرانی میں دیوان کی کتابت کروانے کے بعد اس کو چھپوایا تھا۔ غالباً 1893ء میں مذکورہ دیوان کی طباعت عمل میں آئی۔ اس دیوان کے بارے میں تمکین کاظمی نے لکھا ہے:

''اس دیوان میں 292 غزلیں ہیں جن کے کل 4176 شعر ہیں، رُباعیات 19، مخمس 2 (17 بند)، قصائد 6 (510 شعر)، قطعات 37 (330 شعر)، غیر تاریخی قطعات 4 (46 شعر)، سہرے 4 (40 شعر)، سلام 2 (33 شعر) اور 120 متفرق اشعار ہیں۔ اس طرح یہ دیوان 5318 اشعار کا مجموعہ ہے۔''

تمکین کاظمی نے اپنی تحقیق میں آگے داغؔ کے دیگر دواوین کے بارے میں تفصیل دی ہے۔ ''داغؔ کا سرمایہ شعر'' کے عنوان سے دیئے گئے مضمون میں انہوں نے

یادرفتگاں

داغؔ کے پانچویں دیوان کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔:

''۔۔اس طرح داغؔ کے پانچویں دیوان (۱۔گلزار داغؔ، ۲۔ آفتاب داغ، ۳۔مہتاب داغؔ، ۴۔ یادگار داغؔ، ۵۔ضمیمہ یادگارِ داغؔ) میں کل 1028 غزلیں ہیں جن کے کل اشعار 13779 ہیں، گویا تقریباً چودہ ہزار شعر داغؔ نے غزل کے کہے ہیں۔''

داغؔ دہلوی نے جہاں ایک جانب عشقیہ شاعری کی ہے وہیں دوسری جانب حمدیہ اور نعتیہ اشعار بھی کہے ہیں، داغؔ کے تمام دواوین کا آغاز حمد اور نعت سے ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد فیروز نے اپنے تحقیقی مضمون ''داغؔ: حمد نعت اور منقبت گوئی'' میں بہترین جائزہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ بدنام زمانہ داغؔ نے ایسے بھی شعر کہے ہیں جن پر متقی اور مفتی رشک کر سکتے ہیں۔

داغؔ نے دنیا میں کئے گئے گناہوں کا اعتراف اور اس پر پچھتاوے کو بھی اپنے اشعار میں ڈھالا ہے اور اپنے دواوین میں کئی مرتبہ گناہوں سے معافی کے بھی طلبگار رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد فیروز نے اُن کے تین اشعار پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''داغؔ اور نعت کیوں نہ کہتے، وہ گناہ گار تھے کافر نہ تھے، اس احساسِ معصیت اور اعترافِ گناہ نے انہیں ایسے شعر کہنے پر آمادہ کیا۔:

اے داغ کوئی مجھ سا نہ ہوگا گنہگار
ہے معصیت سے میری جہنم عذاب میں

نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داورِ محشر
مرے گناہوں کا دنیا میں بھی حساب نہ تھا

ابرِ رحمت ہے ادھر دیدہ پرنم ہے ادھر
مشکل اس نامۂ اعمال کا دھونا کیا ہے

داغؔ کے کلام کے گوشوارے میں غزلیات، رباعیات، مخمسات، مسدس، قصاید، قطعات تاریخی وغیرہ تاریخی، سہرا، سلام اور متفرق اشعار کا ایک الگ اندراج تو ہے مگر حمد و نعت اور منقبت کا اندراج نہیں ہے۔ اس کی وجہ خود ڈاکٹر محمد فیروز نے بتائی ہے کہ حمد، نعت، منقبت ردیف وار غزلوں کے ساتھ شائع ہوئیں اور ان پر الگ سے عنوانات درج نہیں تھے۔ تاہم غزلوں کے پہلے شعر یا پھر مطلعوں کو پڑھنے سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ عشقیہ کلام نہیں بلکہ حمد یہ یا پھر نعتیہ کلام ہے۔ نعتیہ کلام کے سلسلے میں داغؔ کے دیوان 'گلزارِ داغؔ'' کی پہلی نعت کے یہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔:

اللہ شوق دے مجھے نعت شریف کا
شہرہ ہو خوب مرے کلامِ لطیف کا

سرسبز کشت دل ہے محمدؐ کے عشق میں
کیا اس زمین میں کام ربیع و خریف کا

مداحِ مصطفیٰ سے کرے کوئی بحث کیا
سحبان خوشہ چین مری طبع ظریف کا

اے داغؔ شعر ڈھل گئے نعت شریف میں
ہے فکرِ قافیہ نہ تردد ردیف کا

داغؔ کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اُن کے وقت

یادِ رفتگاں

میں کئی باتیں کہی گئیں بلکہ بعد کے نقادوں نے بھی ان کی شاعری اور بالخصوص اُن کے کردار کو لے کر کئی سوال کھڑے کئے۔ کہا گیا کہ داغؔ بہت حسن پرست آدمی ہیں، بہت عیاش آدمی ہیں، حتیٰ کہ نیاز فتحپوری نے تو داغ کے قلعہ میں گذارے گئے دنوں پر کئی سوال اُٹھائے اور اُن کے کلام کو محض لفظی کارروائی قرار دیا، چکبست نے لکھا کہ داغؔ طوائفوں کے پیغمبر ہی کہے جاسکتے ہیں، کیونکہ اس دور میں داغؔ کے کلام کو کئی طوائفیں گاتی تھیں، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ داغ سارے ملک میں مقبول تھے اور ان کے شاگردوں کی تعداد کسی نے 5 ہزار تو کسی نے 2 ہزار تو کسی نے 1100 بتائی ہے۔ داغ کی شاعری کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ محض چلبلے اور کھلنڈر سے شاعر ہیں۔ ان تمام باتوں کا جواب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون ''داغؔ دہلوی'' میں کئی دلائل سے پیش کیا ہے جس کو انہوں نے خود فی البدیہہ گفتگو قرار دیا ہے، داغ اور ان کی شاعری پر لگائے گئے الزامات کو جواب دیتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں۔:

''۔۔۔شعر کے فن کے بارے میں داغؔ اور کچھ بھی ہوں یا نہ ہوں، لیکن وہ سنجیدہ شاعر ضرور تھے اور یہ کہنا کہ وہ کھلنڈر سے، بچکانہ قسم کے شاعر تھے درست نہیں۔ مجھ سے کبھی کبھی لوگ پوچھتے ہیں، خاص کر نئے لوگ، کہ کیا پڑھوں شاعری سیکھنے کے لئے۔ تو جہاں میں اور شاعروں کا نام لیتا ہوں ان میں سب سے پہلے داغؔ کا نام لیتا ہوں۔ بعض لوگ حیرت بھی کرتے ہیں کہ داغؔ کا کلام کیوں پڑھواتے ہو۔ اس میں بھلا کیا ہوگا؟ تو میں ان کو بتاتا ہوں کہ اس میں بہت کچھ ہے۔ یعنی ایک طرح سے داغؔ کو آپ Poet's poet کہہ سکتے ہیں کہ ہر طرح کی شاعری اُن کے یہاں موجود ہے۔''

شاعری اور کردار کو جوڑ کر پرکھنے کے طریقہ کار پر بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے دلچسپ تبصرہ کیا اور کہا کہ کسی کے کردار سے اس کی شاعری کو نہیں پرکھا جاسکتا اور نہ ہی معیار بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:۔

''ہم پرانے زمانے کے شعرا کو اس بات پر دھیان دیتے نہیں دیکھتے کہ فلاں کا Character کیا ہے؟ یا کیا رہا ہوگا؟ غالب شراب پیتے ہوں گے، جوا کھیلتے ہوں۔ میر سنی سے شیعہ ہوگئے ہوں گے، اپنا کیا جاتا ہے؟ انہوں نے کیا کیا، کیا ہوگا؟ بڑھاپے میں شادی کی ہوگی۔ ان چیزوں سے ہم ان کی شاعری کو Judge نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی کلاسیکی عہد میں ان چیزوں کو شاعر کی خوبی یا خرابی کا معیار قرار دیا جاتا تھا۔''

داغؔ دہلوی کے اشعار جو زبان زد خاص و عام ہیں ان میں دو شعر کافی مشہور ہیں۔:

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

اور

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

داغؔ دہلوی نے اپنی زندگی میں صرف ایک مثنوی لکھی ہے جسے ''فریادِ داغؔ'' کا نام دیا۔ اس مثنوی میں کُل 838 اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں کلکتہ کی طوائف منی بائی حجابؔ سے اپنے معاشقے کی داستان انہوں نے بیان کی ہے جو کلکتہ کے سفر سے واپسی کے بعد تحریر کی گئی تھی۔ مذکورہ مثنوی صرف دو دن کی کاوش کا نتیجہ تھی اور غالباً جولائی 1882ء میں نظم کی گئی تھی اور کئی بار اس کی طباعت عمل میں لائی گئی۔ داغؔ دہلوی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے خوب کہا ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

''اُردو شاعری میں زبان اور اس کی مزاج شناسی کی روایت کا آغاز سوداؔ سے ہوتا ہے۔ یہ روایت ذوقؔ کے توسط سے داغؔ تک پہنچی۔ داغؔ نے اس روایت کو اتنا آگے بڑھایا کہ انہیں اپنے استاد ذوقؔ اور پیش رو سوداؔ دونوں پر فوقیت حاصل ہوگئی۔''

حضرت داغؔ دہلوی، جن کو استاد ذوق نے شاگرد بناتے ہوئے ناز کیا تھا، غالبؔ نے جن کی کم عمری میں ہی تیور دیکھ کر رشک کیا تھا اور علامہ اقبال جن کو اپنا استاد بھی مانتے تھے بالآخر وہ 16/فروری 1905ء مطابق 9/ذی الحجہ 1322ھ 74 سال کی عمر میں حیدرآباد دکن میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:۔

''9/ذی الحجہ 1322ھ کی شام داغؔ نے اس دارِفانی سے کوچ کیا اس وقت ان کی عمر شمسی حساب سے چوہتر (74) سال تھی۔ میر محبوب علی خان آصف سادس کو اپنے استاد کی رحلت کی بڑا قلق ہوا تھا۔ انہوں نے داغؔ کی شایان شان تجہیز و تکفین کے لئے شاہی خزانے سے تین ہزار روپئے بھجوائے تھے۔ عیدالضحیٰ کی صبح کو داغ کی نماز جنازہ مکہ مسجد میں ادا کی گئی۔ انہیں درگاہ یوسفینؒ میں ان کی رفیقہء حیات کے پہلو میں سپرد لحد کیا گیا۔''

داغؔ کے انتقال پر علامہ اقبال نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:۔

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی
اُٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بُتخانے سے
مئے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون

(بانگِ درا سے انتخاب)

☆☆☆

محمد آصف علی
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)

یادِ رفتگاں

ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

سماجی وسائنسی تحقیق : ایک اجتماعی اور ملی ذمہ داری

تعارف: کسی ملک کی ترقی وخوشحالی کا انحصار و دارومدار محققین، دانشور، فلسفیوں اور اسکالرس پر ہوتا ہے جو ہر وقت حکومت وقت اور معاشرہ کی رہبری کرتے ہیں اور اس کو پروان چڑھانے میں تعلیمی نظام اور تعلیمی ادارے اہم ذریعہ ہوتے ہیں ۔ ہماری جامعات ہیں وہ رہبری کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ قران مجید میں تحقیق، تدبر، تفکر کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، تقریباً 750 سے زاید آیات ایسی جن میں حق تعالی نے فطرت، تاریخ، انسانیت پر تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح تحقیق کرنا خدا کا حکم ہے، ہمارا شرعی فریضہ ہے۔

تحقیقی مطالعہ کی سنہری تاریخ: ہم گذشتہ چار صدیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 850 عیسوی سے 1250 عیسوی تک مسلمانوں کے ہاتھ میں علم وہنر تحقیق کا پرچم رہا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سنہری دور تھا۔ اس کے بعد خارجی اور داخلی وجوہات کی بناء زوال آیا۔ زیادہ تر خارجی بنیادوں پر جس کی وجوہات بغداد پر منگولوں کا حملہ، صلیبی جنگیں، سلطنت عثمانیہ کا بکھر جانا، یوروپی نوآبادیاتی پالیسوں کا ابھرنا جیسے حالات ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ سے علم وتحقیق کا پرچم چھن گیا۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے اسکالرس اس خلا کو پر کریں اور اپنے تحقیقی مطالعہ کو بلند کریں۔ یہ چیز نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ حکومتی سطح پر سماج کے سلگتے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

محققین کے لئے اہم رہنمایانہ اصول: ریسرچ اسکالرس کے لئے یہاں ایک بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ پروفیسر کریگ وائٹ جن کی 3 کتابیں ذہانت کیلئے مشہور ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں IQ کا ذکر کیا، جو اسکالرس کی تربیت میں ضروری ہے۔ ان کتابوں میں انہوں نے دو دہائیوں کے اندر تاریخ اور عصر حاضر کے لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے 14 عادات ایسی بتائی ہیں جس میں ذہین ترین آدمی اپنے وقت کو گزارتا ہے اور ان کا وقت Calculated ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلی بات بتائی کہ وہ اپنے کام کے عادات کے حامی ہوتے ہیں، ریسرچ اسکالرس اپنے کام میں اس بات کو اپنائیں۔ دوسرے وہ لچک میں اور مشکلات میں ہونے کے بعد جلد بحال ہوجاتے ہیں۔ تیسری بات انہوں نے بتائی کہ ان میں نئے کام کی سوچ ہوتی ہے، چوتھے یہ کہ ان میں بچے جیسا تجسس ہوتا ہے، پانچویں یہ کہ ان میں جنون کی کیفیت ہوتی ہے، چھٹی بات یہ کہ ان میں اردگرد کے ماحول سے الگ صلاحیت ہوتی ہے، ساتویں بات یہ کہ ان

میں بغاوت کا جذبہ' مطلب یہ کہ تنقیدی تجزیہ (Critical Analysis) کی کیفیت اور صلاحیت ان میں ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت تیاری کرتے رہتے ہیں' وہ بار بار مسلسل سوچتے رہتے ہیں' وہ آرام بھی کرتے ہیں اور توجہ کو کانسٹریٹ کرنے کا مادہ ان کے اندر ہوتا ہے۔ اب ہم موضوع کے مطابق عالمی ICT Tools کا تذکرہ اور اعادہ کرتے ہیں۔ ہم اس بات سے واقف ہیں کہ عالمی تحقیق کے ان رجحانات کو سمجھنا ضروری ہے' اس کے لئے اہم بات گوگل اسکالر کو ریفر کرتے رہیں' مائکرو سافٹ اکیڈیمک سرچ' سائنس اسکوپ ریسرچ گیٹ' بائیو ڈیپ ڈرائیو: ڈیجیٹل لائبریری' سوٹیرو وغیرہ ایسے ICT Tools ہیں جن سے واقفیت ضروری ہے۔

محققین کے لئے ایک نصیحت آموز واقعہ: آخر میں ریسرچ اسکالرس کی ترغیب کے لئے ایک اہم واقعہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے ٹاڈ ہنری کی ناول Die Empty پڑھی ہوگی یا سنی ہوگی' اس میں وہ ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ وہ کسی کاروباری میٹنگ کے سلسلہ میں گیا ہوا تھا' میٹنگ میں ایک ڈائرکٹر نے سوال کیا کہ سب سے قیمتی جگہ کونسی ہے' مختلف لوگوں نے مختلف جگہوں مثلاً مڈل ایسٹ میں کوئی مقدس مقام کا بتایا' کسی نے ساؤتھ افریقہ کی مائننگ کے کسی مقام اور کسی نے کچھ اور نام بتائے۔ ٹاڈ ہنری سب کو رد کرتا گیا۔ پھر اس نے خود بتایا کہ نہیں سب سے قیمتی جگہ قبرستان ہے۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ کیسا ہوسکتا ہے؟ وہاں تو مردے رہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے اس لئے کہا کہ دنیا میں روزانہ لاکھوں کروڑوں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں' ان میں بہت سارے لوگ اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور بہت سارے ان صلاحیتوں کے ساتھ قبر میں دفن ہوجاتے ہیں اور وہ قبرستان کا حصہ بن جاتے ہیں' وہ بتاتا ہے کہ دنیا میں جب آئے ہیں تو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ بہرحال ٹاڈ ہنری کا پیام ہمارے ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک اچھا سبق ہے۔

اختتامیہ: قوموں کے عروج وزوال میں سائنسی نقطہ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے' اس لئے کہ علم کی بنیاد تحقیق ہوتی ہے اور تحقیق کی بنیاد وہ سوچ وفکر جس کو انسان اپنے ادراک وفہم سے منضبط کرتا ہے' اسی لئے انسان کو اشرف المخلوق کہا گیا۔ اقوام کی حکمرانی اور غلامی دونوں کا تعلق صرف سرمایہ' ترقی اور صنعتوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ انسانی وسائل کو پوری قوت کے ساتھ تحقیقی اور مدبرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سماجی زندگی کو پرامن اور خوشحال سماج کو یقینی بنایا جائے۔ اگر ہم تحقیق کو بھی عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور روایتی نقطہ نظر سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں تو یقیناً ایک بڑا میدان ہمارے سامنے ہے اور کامیابی کے ساتھ بہترین نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس سائنسی فکر اور تحقیقی مزاج کو فروغ دینے کے لئے نہ صرف حکومتیں آگے آئیں بلکہ تمام شہری سماج کے ادارے' مذہبی انجمنیں اور علمائے دین اس مزاج کو فروغ دیں تو یقیناً آفاق اور انفس میں تدبر کرنے کا حق ادا ہوگا۔

☆☆☆

مضامین

دھوکے کا گھر

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے
کبھی غور سے بھی دیکھا ہے تو نے
جو معمور تھے وہ محل اب ہیں سُونے

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

ملے خاک میں اہل شان کیسے کیسے
مکیں ہوگئے لامکاں کیسے کیسے
ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھاگئی آسماں کیسے کیسے

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

اجل نے نہ کسریٰ ہی چھوڑا نہ دارا
اسی سے سکندر سا فاتح بھی ہارا
ہر ایک چھوڑ کے کیا کیا حسرت سدھارا
پڑا رہ گیا سب یہیں ٹھاٹ سارا

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

تجھے پہلے بچپن میں برسوں کھلایا
جوانی نے پھر تجھ کو مجنوں بنایا
بڑھاپے نے پھر آکے کیا کیا ستایا
اجل تیرا کردے گی بالکل صفایا

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

یہی تجھ کو دُھن ہے رہوں سب سے بالا
ہو زینت نرالی، ہو فیشن نرالا
جیا کرتا ہے کیا یونہی مرنے والا؟
تجھے حسنِ ظاہر نے دھوکے میں ڈالا

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سُو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے
کبھی غور سے بھی دیکھا ہے تو نے
جو معمور تھے وہ محل اب ہیں سُونے

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

ڈاکٹر جعفر جری

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد میں غزلِ مسلسل

دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام سنہ ۱۳۴۷ء مطابق ۷۴۷ھ میں عمل میں آیا۔ بہمنی سلاطین نے شمالی ہند کے حکمرانوں کے تسلط سے نہ صرف ملکی اور سیاسی سطح پر آزادی حاصل کی بلکہ شمال سے اپنے آپ کو ممیّز اور مختلف رکھنے کے لیے اُنھوں نے شمالی ہند کے حکمرانوں کی ہند اِیرانی تہذیب کے مقابلے میں اپنی سلطنت میں دکنی تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اَہلِ شمال کے برخلاف اِن حکمرانوں نے فارسی کو درباری زبان تو برقرار رکھا لیکن اس کے ساتھ اُنھوں نے دکنی زبان کی بڑی سرپرستی کی۔ چناں چہ اُردو کے اوّلین اَدبی کارنامے بہمنی سلطنت ہی کی دین ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی کے علاوہ بہمنی عہد میں غزل کا بھی رواج ہوا۔ ان اوّلین غزل گو شعراء میں مشتاقؔ بیدری، لطفیؔ، فیروزؔ، قریشیؔ اور حافظؔ دکنی وغیرہ اہم ہیں۔ بہمنی سلطنت کے بعد زوال دکن میں پانچ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں سیاسی، تاریخی تہذیبی اور اَدبی اعتبار سے گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

●

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی تھا، جو بہمنی حکومت کا ایک صوبہ دار تھا' سلطان محمود شاہ بہمنی کے اِنتقال بعد ۹۲۴ھ میں اَپنے صوبہ تلنگانہ میں خودمختاری کا اعلان کیا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ گولکنڈہ پر اِس خاندان کے آٹھ بادشاہوں نے کم و بیش دو سو سال حکومت کی۔ قطب شاہی سلاطین خود بھی صاحبِ علم تھے اور علوم وفنون کے قدردان بھی۔ اِنھوں نے اپنی سلطنت میں فنونِ لطیفہ اور تہذیب وتمدن کی بڑی سرپرستی کی۔ اِن کے دربار میں اہلِ علم اور اہلِ ہنر اور اَربابِ سخن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ اَدیبوں اور شاعروں کو اِنعام واِکرام سے مالا مال کیا کرتے تھے۔

جب ہم اُردو شاعری میں غزلِ مسلسل کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے دبستانِ گولکنڈہ پر ہی پڑتی ہے۔ غزلِ مسلسل ایسی کوئی قطعی جداگانہ صنف نہیں ہے کہ اِس کے آغاز و اِرتقاء کی نشاندہی کی جائے۔ لیکن اِتنا ضرور ہے کہ ہمارے اِبتدائی دور کے غزل گو شاعروں کے ہاں غزلِ مسلسل کے خاصے نمونے مل جاتے ہیں۔ بعض کے ہاں کم تو بعض کے ہاں زیادہ۔ دکنی شاعری کئی زاویوں سے اِمتیازی اور انفرادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے ہم دکنی کو صرف لسانی اور تاریخی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن دکنی کا سیر حاصل جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی اَدبی قدر و قیمت کبھی کم نہیں رہی۔ دکنی شعراء کے دیوان اور کلیات

مضامین

موجود ہیں جن میں انھوں نے شاید ہی کوئی صنفِ سخن ہوگی جس کو نظر انداز کیا ہو۔ غزلِ مسلسل کو بھی ہمارے دکنی شاعروں نے آزمایا ہے اور بعض کے ہاں تو نہایت دل کش اور عمدہ غزل ہائے مسلسل ملتی ہیں۔ یہاں اِن دونوں سلاطین کے چند اہم شاعروں اور اُن کی غزلِ مسلسل پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

● **محمد قلی قطب شاہ** : اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں جہاں باعثِ کشش کئی اصناف ہیں وہیں غزلِ مسلسل بھی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں کئی ایک تخلیقات ایسی ہیں جن پر کوئی نہ کوئی عنوان دیے جانے کی وجہ سے یہ نظم محسوس ہوتی ہیں۔ دیکھا جائے تو ایسی کئی نظمیں نظمیں نہیں بلکہ غزل قرار دیے جانے کی مستحق ہیں۔ اِس قسم کی تمام نظمیں دراصل غزلِ مسلسل ہی ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثرؔ بھی اِسی خیال کے حامی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''غزل اُس کی (محمد قلی کی) محبوب صنفِ سخن بن گئی یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ہم نظم کہتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت لکھی ہوئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔''

{ڈاکٹر محمد علی اثرؔ۔ ''دکنی غزل کی نشوونماء''۔ ص:۱۲۵۔ سنہ اشاعت اور مقام: ۱۹۸۶ء حیدرآباد۔}

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ سے ذیل کی نظم دیکھیے جو ''بسنت'' کے عنوان کے تحت درج ہے۔ دراصل یہ غیر مردف غزلِ مسلسل ہے، جس میں محمد قلی نے بسنت کے تہوار کی رنگینیوں کا ذکر کیا ہے:

بسنت کھیلیں عشق کا آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نچھل کندن کے تاراں انگ چھونا
بندی ہوں چھند بندسوں کر سنگارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسمان رنگ شفق پایا ہے سارا
شفق رنگ چھینے میں تارے تگٹ جوں
سُرج کرنا نمن زرتار تارا
پیا پگ پڑ ملا کر لیائی پیاری
بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا
جو بن کے حوض خانے رنگ مدن بھر
سو روما روم چرکیاں لائے دھارا
بھیگی چولی میں بھیٹن نس نشانی
عجب سورج ہے کیوں کرنس کوں ٹھارا
بسنت ونت چھند سو کند گال اوپر
پھولایا آگ کیسر کی بہارا
نبیؐ صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رسہیا تر لوک سارا

{''کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ'' مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ص: ۳۷۵۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء ناشر: ترقی اُردو بیورو۔ نئی دھلی۔ سلسلہ مطبوعات۔ ترقی بیورو نمبر ۴۳۷۔}

مضامین

محمد قلی قطب شاہ نے غزلوں بالخصوص غزلِ مسلسل میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے کہ خیال کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور زنجیر کی یہ کڑی کہیں بھی ٹوٹنے یا چھوٹنے نہیں پاتی۔ غزلِ مسلسل کے لیے جیسا کہ ضروری ہے۔ ہر شعر کو غزل کا ایسا جزو ہونا چاہیے جس طرح منظر کا کوئی حصہ کہ اگر وہ نہ ہو تو منظر نامکمل بے رنگ اور بے رس محسوس ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے ہاں متعدد ایسی غزل ہائے مسلسل ملتی ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے محمد قلی قطب شاہ کی غزل کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کی غزلیں تغزل سے مملو ہیں۔ عشق اور عاشقی کی روئداد کو نہایت عریاں الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ اس امر کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دردِ دل کا اظہار اشعار میں کیا ہے' اس کی عشقیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں سادگی، صفائی اور شیرینی پائی جاتی ہے اور کلام میں پختہ ہے۔''

{''دکن میں اُردو'' مصنف : نصیرالدین ہاشمی ۔ ص: ۱۰۰ ۔ سنہ اشاعت : ۱۹۸۵ء ۔ ناشر: ترقی اُردو بیورو ۔ نئی دھلی ۔}

محمد قلی قطب شاہ نے دیگر موضوعات پر بھی کم طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر جہاں تک غزلِ مسلسل کی ہیئت اور تکنیک کا سوال ہے اس کا مقام و مرتبہ دکنی ہی میں کیا مجموعی طور پر اُردو کے اور شاعروں میں بھی اونچا اور ممتاز ہے۔

- **سلطان عبداللہ قطب شاہ** : دبستانِ گولکنڈہ کا ایک اور ممتاز شاعر سلطان عبداللہ قطب شاہ ہے۔ اس کا مکمل دیوان اگرچہ دستیاب نہیں ہوا لیکن جتنا بھی کلام محققین نے تلاش کر کے طبع کیا ہے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہ طور شاعر غیر معمولی اونچے مقام کا حامل ہے۔ اس کا مزاج بنیادی طور پر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ حسن و عشق کا متوالا، شراب و شباب کا رسیا اور فطرت کے نظاروں پر قربان سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اپنے اشعار میں جا بجا اپنے ذوق و شوق کا اِظہار کیا ہے۔ اس کی غزلیں دکنی شاعری میں نئے مزاج کی غمازی کرتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح اس نے بھی جہاں جہاں حسن و عشق کا بیان غزلوں میں کیا ہے وہاں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مربوط نظر آتا ہے، گویا اِس کی ایسی غزلیں غزلِ مسلسل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ (مرتبہ سید محمد) کے مطالعے سے ایسی کئی غزلیاتِ مسلسل قارئین کو محظوظ کرتی ہیں، ایک غزلِ مسلسل درج کی جاتی ہے:

تج کاج کا جھمکتا موتی وو گوشیارا
دستا ہے منج ثریا کا عین جیوں ستارا
چوٹی تری مدھاری چھب سوں سہا نہاری
لبدا لے گئی ہماری سدھ چین ایک بارا
تج بھوں جو ہے سج نوں اس نوں پہ جیو ہے اجنوں
گزریا ہے دورِ مجنوں، یو دور ہے ہمارا
تو چلبلی بٹیا ہے تو جگ میں غل اُٹھیا ہے
وو زلف جو چھٹیا ہے مہکار اُٹھیا ہے سارا
چوندھر کھلیں ہیں چمناں گمنا تو تج سوں گمنا

مضامین

یہ آرزو ہے ہمنا دن رات اَئے نگارا
مدرس منجے پلانا فرصت یہی ہے آنا
اس جیو کوں کیا پیتانا یو جیو ہے باوا بارا
صدقے نبیؐ کے حالی شاہ عبداللہ وصالی
عاشق ہے تیرا بالی، ہم جیو کا ہے پیارا

{"دیوانِ عبداللہ قطب شاہ" مرتبہ : سید محمد ۔ ص: ۲۴ ۔ ۲۵ سنہ اشاعت: ۱۹۵۶ء ناشر: مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات اور دکن ساھتیہ پرکاش سمپتی کی مشترکہ کمیٹی ۔}

اِس غزلِ مسلسل میں محبوب کے حسن اور اس کے سنگھار کے سوائے کوئی بات نہیں ملتی۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرے کان میں گوشوارے کا موتی چمکتا ہے جو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ستارہ ثریاؔ دمک رہا ہو۔ تیری تین بل والی چوٹی اور تیری ادائیں تجھ کو زیب دیتی ہیں۔ لیکن اِنہی اَداؤں نے ہمارے دل کے سکھ چین کو لوٹ لیا ہے۔ تیری بھویں دیکھ کر ہم پر وہ کیفیت گزر گئی جو مجنوں پر گزری تھی۔ تیری شوخی اور شرارتوں اور چلبلے پن کا ساری دنیا میں غل اُٹھا ہے اور تیری زلف جو آگے بڑھی ہوئی ہے اس کی خوشبو سے سارا جگ مہک اُٹھا ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ ہم رات دن اپنے محبوب کے ساتھ چمن چمن گھومتے رہیں۔ اَئے محبوب یہ فرصت کا وقت ہے، تو ہمیں شراب پلانے آ، کیوں کہ اِس زندگی کا کیا اَعتبار جو غیر یقینی اور بے ثبات ہے۔ آخر میں نبیؐ کے صدقے عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے کہ اَئے محبوب میں تو تیرا عاشق ہوں اور تو ہماری زندگی کا حاصل اور پیارا ہے۔ کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ میں اور بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں۔

پروفیسر محمد علی اثرؔ نے عبداللہ قطب شاہ کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے:

''اِظہارِ بیان کی سادگی عبداللہ کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ قدیم اُردو کے دوسرے بلند پایہ شاعروں کی طرح عبداللہ کی غزلوں میں بھی سادگیِ بیان، بے ساختگی اور روانی بہ درجہء اُتم موجود ہے۔ اس نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات کو سیدھی سادی زبان اور رواں پیرایہء بیان میں پیش کیا ہے۔''

{"دکنی غزل کی نشوونما" مصنف : ڈاکٹر محمد علی اثرؔ۔ ص: ۶۱ سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء ۔ ناشر: الیاس ٹریڈرس ، حیدرآباد ۔}

بیش تر دکنی شاعروں کی طرح عبداللہ قطب شاہ کے کلیات میں غزل ہائے مسلسل کئی ملتی ہیں جو فنی اور اَدبی دونوں معیارات سے قابلِ توجہ ہیں۔

● **ملاّ غواصیؔ**: غواصیؔ کو گولکنڈے کے ملک الشعراء کی حیثیت سے دکنی شاعری میں نہایت اعلیٰ و اَرفع مقام حاصل ہے۔ غواصیؔ نے مثنویاں بھی لکھیں لیکن اس کی غزلیں بھی غضب کی ہیں۔ کلیاتِ غواصیؔ کے مطالعے سے اَندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ملک الشعرا کہلانے کا مستحق ہے۔ غواصیؔ کی غزلوں میں دکنی شاعری کی روایت کے مطابق حسن و عشق کے موضوعات بھی بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اِسی کے ساتھ غزل کے فنی اور اَدبی

تقاضوں کی پاس داری بھی غواصؔی نے بہ تمام وکمال کی ہے۔ جہاں تک غزلِ مسلسل کا تعلق ہے، غواصؔی کے ہاں ایسی غزلوں کی بھی کمی نہیں اور ایسی غزلیں برائے نام نہیں بلکہ اِن میں معنی ومفہوم کی دنیا پنہاں ہوتی ہے۔ مثلاً درجِ ذیل غزل ملاحظہ ہو:

یکیلا نیند کڑوی کر جو میں ہر رات پھرتا ہوں
بکھیرا انجھواں کے تاریاں کوں چندر کی دھات پھرتا ہوں
گھڑی کوں دل گھڑی کوں جیو یو دونوں کھینچتے وو دھر
قرار یک تل نئیں منج کوں ہاتے ہات پھرتا ہوں
ادکھ سورات لیلیٰ کی کیا تو کیا ہوا مجنوں
کہ میں اس تھے بی تج تئیں زیاست کو سورات پھرتا ہوں
مبادابات کیں میرے پرت کی پھٹ پڑے گی کر
گنگا ہو جیب کوں کردان سٹ دے بات پھرتا ہوں
نپٹ گرم آہ کے بارے تھے دبلے اِس تنک تن سوں
زمیں نرتل اپر ہو جیوں جھڑیا سوں بات پھرتا ہوں
برہ تھے ادموا ہوکر رھیا تو کیا ہوا یوں میں
کہ باطن میں رگے رگ جیو ہو سب ذات پھرتا ہوں
غواصؔی منج دیوانے کوں نہیں ذرہ خبر کچ یو
جو کاں گمتا ہوں کاں اچتا ہوں کس سنگات پھرتا ہوں

{"کلیاتِ غواصیؔ" مرتبہ : پروفیسر محمد بن عمر۔ ص: ۱۴۳ سنہ اشاعت: ۱۹۵۹ء۔ ناشر: ادارہ ء ادبیاتِ اردو، حیدرآباد ۔}

اِس غزلِ مسلسل میں غواصؔی نے ہجر کی کیفیات کو مسلسل زاویوں سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنی نیند خراب کرکے ہر رات بے مقصد گھومتا پھرتا ہوں، تاروں کی طرح اپنے آنسوؤں کو بکھیر کر میں چاند کی طرح خلاؤں میں رواں ہوں، میرا دل وقت کو اور وقت دل کو کھینچتے رہتے ہیں۔ مجھے ایک لمحہ قرار نہیں، میں بس اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا ہوں۔ یہاں شاعر مجنوں سے مخاطب ہے کہ اس نے لیلیٰ کے غم میں اپنی راتیں خراب کیں تو میں بھی اپنے محبوب کے غم میں رات کو پھرتا رہتا ہوں۔ اِس اندیشے سے کہ میری محبت کی باتیں لوگوں پر ظاہر نہ ہو جائیں میں گونگا بن کر خاموش رہا کرتا ہوں، کہیں آہوں کے باعث میرا دبلا پتلا جسم متاثر نہ ہو، میں زمین پر نہایت احتیاط سے گزارا کرتا ہوں۔ محبوب کی جدائی میں اگر میں نے اَدھ موا ہوکر زندگی گزاری تو کیا ہوا کہ درون میں تو میں اپنی ذات کی رگ رگ میں زیست کرتا ہوں۔

آخر میں غواصؔی اس بات پر اپنی غزل ختم کرتا ہے کہ میں دیوانہ ہوں مجھ کو کہیں کی کوئی خبر نہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کہاں گھومتا ہوں، کہاں رہتا ہوں اور کس کے ساتھ پھرتا ہوں۔ غواصؔی کے ہاں ایسی اور کئی غزلِ مسلسل ہیں۔ غواصؔی کی شاعرانہ عظمت کو پروفیسر محمد علی اثرؔ یوں نمایاں کرتے ہیں:

''جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصؔی دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ غزل کے میدان میں قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اِس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے

مضامین

کو پہنچ سکتا ہے۔''

{"دکنی غزل کی نشوونما" مصنف : ڈاکٹر محمد علی اثرؔ۔ ص: ۱۸۶ سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء۔ ناشر: الیاس ٹریڈرس ، حیدرآباد ۔}

دبستانِ گولکنڈہ کے اور شاعروں کے ہاں بھی ایسی غزلیں مل جاتی ہیں۔ایک بات یہ بھی ہے کہ اُس زمانے میں نظم کا تصور عام نہیں تھا۔غزل اُردو شاعری کی جان اور آن تھی اور لگ بھگ ہر شاعر کے ہاں جن میں احمدؔ، بلاقیؔ، جنیدیؔ، اِبن نشاطیؔ، شاہ راجو حسینیؔ اور تاناشاہؔ کے نام ہیں جن کے ہاں بھی غزلیاتِ مسلسل ملتی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ صاحبِ دیوان شعرا نہیں تھے۔ اِن کی چیدہ چیدہ غزلیں قدیم قلمی بیاضوں میں ملتی ہیں۔

●

بہمنی سلطنت کے جانشینوں میں قطب شاہی سلطنت کے ساتھ شعروادب کے سلسلے میں اگر کوئی نام لیا جاتا ہے تو وہ عادل شاہیوں کا ہے۔ عادل شاہی سلاطین بھی نہ صرف شعر و اَدب کے دل دادہ اور سرپرست تھے بلکہ ان میں سے کئی اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی رہے ہیں۔علی عادل شاہ شاہیؔ کا نام ان سب میں ممتاز اور روشن ہے۔ کہنے کو تو دبستانِ دکن کے رشتے سے عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین بڑی حد تک ہم مزاج اور ہم ذوق رہے ہیں۔

لیکن لسانی اور جغرافیائی حالات ان پر کچھ اس طرح اثر انداز رہے کہ ان دونوں سلاطین کے دبستان ہائے شعروادب کو ایک دوسرے سے ممیّز کیا جاسکتا ہے۔ گجرات سے قربت کے باعث عادل شاہی سلاطین اور وہاں کے شعروادب پر گجراتی زبان و اَدب کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔اسی واسطے سے شمالی ہند سے بھی اِن کا رشتہ ایک حد تک قریبی رہا لیکن گجری زبان واَدب نے شعروادب میں دبستانِ گولکنڈہ اور دبستانِ بیجاپور کو اپنے طور پر قابلِ لحاظ حد تک متاثر کیا ہے۔ خاص طور پر بیجاپور کے دکنی شعرا گجری روایت کے اثر پذیر رہے۔ یہاں مقابلہ یا موازنہ مقصود نہیں ہے تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں دبستان اپنے اپنے طور پر اُردو اَدب کا گراں بہا حصہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں تصوف کا رنگ ہے تو کہیں عشق مجازی کا' کہیں صنفِ مثنوی پر زور ہے اور صنفِ غزل کا ہمہمہ ہے۔لیکن مجموعی طور پر یہ دونوں وزن ووقار کے حامل ہیں۔

عادل شاہی سلاطین نے بھی شعروادب کی غیر معمولی سرپرستی کی۔ اِن کے دربار سے وابستہ شعرا کے نام اُردو شاعری کی تاریخ میں مہکتے اور جگمگاتے رہے ہیں اُن میں نصرتیؔ، مقیمیؔ، حسن شوقیؔ، ملکؔ خوشنود، ہاشمیؔ اور معظمؔ جیسے قادرالکلام اور اُستاد المرتبت شاعروں کی وجہ سے دبستانِ بیجاپور کی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔

● **حسن شوقیؔ** : دکنی شاعری خصوصاً دکنی غزل کی تاریخ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔حسن شوقیؔ غزل کا ایک قادرالکلام سخن ور، جس نے اپنے تغزل سے آنے والی کئی نسلوں کو متاثر کیا، چناں چہ ڈاکٹر جمیل جالبیؔ لکھتے ہیں:

مضامین

''اِس کی غزل، قدیم زبان کے باوجود آج بھی بے کیف و بے اَثر نہیں ہے بلکہ سوز و شیرینی کے ملے جلے اَثرات دل کے تاروں کو آج بھی مرتعش کرتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں اِس اَثر کو پیدا کرنے کے لیے شوقیؔ عام طور پر رواں بحروں کا اِنتخاب کرتا ہے۔''

{ "تاریخِ اَدب اُردو " ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ ص : ۱۹۱ ۔ ناشر : ایجو کیشنل پبلیشنگ ہاؤس ۔ نئی دھلی ۔}

حسن شوقیؔ کی غزلیں رودادِ حسن و عشق کے دل آویز مرقعے ہیں۔ حسن شوقیؔ نے اپنی شاعری میں حسن کی پرستش کی ہے اور دِل و جان سے اپنے محبوب کو چاہا ہے۔ اُن کی غزلوں میں جابہ جا محبوب کے زلف و گیسو، لب و رخسار، خال و خط اور چشم و جبین کی باتیں ملتی ہیں اور یہاں تک کہ اُنھوں نے غزلِ مسلسل سے کام لیتے ہوئے اپنے محبوب کے حسن اور اس کے سراپا کی تفصیل تسلسل کے ساتھ بیان کی ہے۔

''دیوانِ حسن شوقیؔ'' مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی پہلی غزل ہی غزلِ مسلسل کے ذیل میں آتی ہے، جس میں شوقیؔ نے اپنے محبوب کی نہایت فراخ دلی کے ساتھ قصیدہ خوانی کی ہے:

تجہ مکہ کنول کنولے بدل جگ میں سو رنگ لالا ہوا
تجہ زلف تھی ، اپچی بھنور دو جی بھونگ کالا ہوا
تجھ نین تھی نرگس کھلی عھر کھلی بنکش پھلی
تجہ خوئی تھی دونا ہوا، مروا ہوا، بالا ہوا
تجہ بال کالے رات ہور بالا سو کہتے دیس ہے
تجہ بال ہور بالا مگر ہنگام چڑ کالا ہوا
تجہ ناز کے بیداد تھی ویراں ہوا ہے کانورو
تجہ لب شکر کے قول تھی معمور بنگالا ہوا
اُفتاں و خیزاں روز و شب تنہا پھروں سنسار میں
جس وقت تھی تجہ نیہہ کا مد پیہہ متوالا ہوا
مجہ جگ پہ جگ چنچل انجھواں تھی یک رتری ہوری
اس عکس کے معکوس سوں نکتے سرنگ مالا ہوا
شوقیؔ ہماری برہ کا آسانِ جیوں جو کہیا فلک
پاسنگ اس میزان کا کاویل ترنالا ہوا

{ "دیوانِ حسن شوقیؔ " مرتبہ : ڈاکٹر جمیل جالبیؔ ص : ۱۳۹ ۔ ۱۴۰، ناشر : انجمن ترقی اُردو، پاکستان ۔ اشاعتِ اوّل ۱۹۷۱ء }

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ تیرے چہرے کے کنول اپنی مثال آپ ہیں۔ لالا کا تیری زلف سے کیا مقابلہ۔ تیری آنکھیں نرگس مثال ہیں، تیرے بال جنھیں کالی رات سے تشبیہہ دی جائے تو کم ہے، تیرے ناز و انداز کا ظلم یہ ہے کہ گاؤں گاؤں ویران ہو گئے، تیرے لبوں کی مٹھاس ایسی کہ سارا بنگال مخمور ہو گیا ہے ۔ میں جب سے تیری محبت کا دیوانہ ہوا ہوں ٗ سنسار میں رات دن حیران و پریشان تنہا پھر رہا ہوں، ساری دنیا میں تیرے حسن کا جواب نہیں۔ آخر میں شاعر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اے شوقیؔ ہماری جدائی کا زمانہ کیا بتائیں اُس کا پاسنگ بھر بھی بیان ہو تو لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔

● **علی عادل شاہ شاہیؔ:** (۱۰۶۸ھ تا ۱۰۸۳ھ) دبستانِ بیجاپور کے غزل گوشعراء میں نہایت ممتاز مقام کا حامل ہے۔ شاہیؔ دکنی زبان کا ایک خوش فکر اور قادرالکلام شاعر گزرا ہے۔ اُس نے مختلف اَصناف سخن میں طبع آزمائی کی، اُس کے کلیات میں قصائد، مثنویات، مخمسات، مثمنات، رباعیات اور گیتوں کے علاوہ غزلیات بھی موجود ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اِن میں سے بعض غزلیات غزلِ مسلسل کے دائرے میں آتی ہیں۔ شاہیؔ کی غزل گوئی پر اِظہارِ خیال کرتے ہوئے اُستاذ الاساتذہ ڈاکٹر زینت ساجدہ رقم طراز ہیں۔

''شاہیؔ کی غزلوں کے مطالعے سے اس کی قادرالکلامی، اُپج، جدت اور فنّی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اُن شاعروں میں سے نہیں جو لکیر پیٹتے ہیں بلکہ اُن میں سے ہے جو عام روش سے ہٹ کر اپنے لیے نیا راستہ نکالتے اور فکر و فن کو نئی وسعتیں بخشتے ہیں۔ وہ ہر رنگ میں غزل کہنے پر قادر تھا۔ لیکن اُس کے ہر شعر پر اُس کی اپنی شخصیت اور انفرادیت کا نقش بہت گہرا ہوتا ہے۔''

{''کلیاتِ شاھی'' (یعنی علی عادل شاہ ثانی کا اُردو کلام) مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ ۔ مقدمہ مشمولہ ص: ۸۵ ۔ سلسلہ مطبوعات، حیدرآباد اُردو اکادمی مقام اور سنہ اشاعت: ۱۹۶۲ء حیدرآباد ۔}

غزل کی عجمی روایت کے مطابق شاہی کی غزل حسن و عشق کی واردات کا آئینہ ہے۔ لیکن اس کی غزل میں حدیثِ دلبری سے زیادہ طلسم فن کی کارفرمائی ہے۔ خاص طور پر وہ غزلیں جو کسی موضوع یا واقعہ پر لکھی گئی ہیں، اپنی مثال آپ ہیں۔

شاہیؔ کے کلیات میں غزلِ مسلسل کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں اس نے ایک ہی موضوع پر مسلسل اِظہارِ خیال کیا ہے یا تمام غزل میں ایک ہی کیفیت اور ایک ہی فضاء کو برقرار رکھا ہے۔ درجِ ذیل غزلِ مسلسل پیش ہے۔

تجھ گال پر نکھ کا نشان دستا ہے مج اس دھات کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا
تج زلفِ مشکیں دیکھ کر سانپاں تجے ان پان سب
تج لب کیری لالی انگے لالاں سٹے سدگات کا
ابرو کماناں کھینچ کر، مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشاں تج ہات کا
مکڑا سکی کا عید سا دستا اچنبھا روپ سوں
تس کیس پر زر انچل جھلکاٹ ہے شبرات کا
تیرے بچن شیریں اَنگے شکر دیکھو کھاری لگے
مکھ میں اوچا کاڑی لیا ڈر کر ہیا نابات کا
بدبل پرت کا ماند کر شاہیؔ سوں جب بازی کرے
لیتی بھلا من کا ترنگ رخ لیا رکھے شہ مات کا

{''کلیاتِ شاھی'' (یعنی علی عادل شاہ ثانی کا اُردو کلام) ۔ مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ۔ سلسلہ ء مطبوعات، حیدرآباد اُردو اکادمی ۔سنہ اشاعت: ۱۹۶۲ء حیدرآباد ۔}

شاہیؔ نے اِس غزلِ مسلسل میں معشوق کے حسن و شباب، تناسب اعضاء اور رعنائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

مضامین

اے محبوب تیرے گال پر ناخن کا نشان ایسے دکھائی دیتا ہے، جیسے روشن شفق میں پہلی رات کا چاند جگمگاتا ہے۔ تیری زلف مشکیں کو دیکھ کر سانپوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور تیری سرخی لب کے آگے لعل بھی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے ہیں۔ تو جب اَبروؤں کی کمان کو کھینچ کر پلک کے تیر چھوڑتا ہے تو اُن سے دل کا ہرن زخمی ہوجاتا ہے۔ سکھی کا چہرہ عید جیسا بارونق ہے اور اس کے سر پر زر کے آنچل کی جگمگاہٹ شب برات کی طرح روشن ہے۔

اَے محبوب تیری میٹھی باتوں کے آگے شکر بھی کھاری لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجھ سے ڈر کر شکر اپنے منھ میں کاڑی پکڑی ہے۔ جب تو شاہی کے ہوش اُڑا کر اس سے بازی کھیلتی ہے تو اس کے دل کا ترنگ اُڑا لیتی ہے اور شہ مات کا رُخ لاکر دیتی ہے، شاہی کے کلیات میں اور بھی کئی غزلِ مسلسل موجود ہیں۔

سید میراں ہاشمی : بھی ایک ایسے ہی پُرگو اور شاعرانہ ہنرمندی کے حامل شاعر گزرے ہیں، کہتے ہیں وہ نابینا تھے اور مہدوی مسلک کے حامل تھے۔ ہاشمی کے بارے میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے کچھ زیادہ معلومات بہم نہیں پہنچائی ہیں۔ خود اُن کے نام کے بارے میں مختلف محققین نے مختلف باتیں کہی ہیں۔ ہاشمی کے وطن، سنہ پیدائش، اُن کی زندگی کے دیگر حالات وغیرہ کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ قوی شہادتوں کی روشنی میں بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی کہا جاسکتا ہے کہ ہاشمی کا اِنتقال ۱۱۰۹ ہجری، بیجاپور میں ہوا اور یہیں اُن کا مدفن ہے۔ ہاشمی نے مثنویاں بھی لکھی ہیں اور نظمیں و غزلیں بھی لیکن ریختی گوئی کی وجہ سے ہاشمی کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ریختی کے لیے عموماً غزل کی ہیئت برتی جاتی ہے۔ چناں چہ ہاشمی کی ریختیاں بھی غزل کی ہیئت میں موجود ہیں یہاں ہاشمی کی ریختی گوئی کا جائزہ لینا مقصود نہیں اور نہ ہی اُس کا محل ہے۔ لیکن ان کے یہاں غزلوں میں کئی ایسی غزلیں ہیں جن میں ہاشمی نے غزلِ مسلسل کی تکنیک سے کام لیا ہے۔ ہیں تو یہ ریختیاں ہی لیکن غزلِ مسلسل کے پیرائے میں ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ہاشمی کے ہاں ریختی موضوعات پر کئی غزلِ مسلسل ملتی ہیں، ایک غزلِ مسلسل پیش ہے:

اُنو آویں تو پردے سوں گھڑی بھر بھار بیٹھونگی
بہانا کرکے موتیاں کے پروتے ہار بیٹھونگی
اُونو یاں آوَ کیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اٹھلتی اور مٹھلتی چپ گھڑی دوچار بیٹھونگی
نزدیک میں دوڑ جانے کوں خوشی سوں چپ اُچھل رھونگی
ولے لوگاں میں دِکھلانے کوں ہو بیزار بیٹھونگی
پکڑ کر ہات پردے میں لیجاوینگے تو جھڑکونگی
گھونگھٹ میں مکھ چھپا کر ٹک میں تڑکا مار بیٹھونگی
بلایاں جیو کے جیو میں لے پڑونگی پاؤں میں دل سوں
ولے ظاہر میں دِکھلانے کوں ہو اَغیار بیٹھونگی

مضامین

کروں گی ظاہرانا چپ غصہّ اور مان ہٹ لیکن
سریجن پر تے جی اَپنا جیو میں وار بیٹھونگی
سلادینگے تو سوونگی اُٹھونگی واں تے یوں کہہ کر
چپوخوں وا خوشی میری میں ہو ہوشیار بیٹھونگی
کتی بیزاری دیتے ووئی جو بیٹھی تو نزیک اتنے
مجھے سوگند ہے جو آکر یوں دوسری بار بیٹھونگی
کنے کو چپ کتی ہوں میں وَلے جی میں گھٹ کئی ہوں
نزیک ہو ہاشمی کے مل میں آٹھوں پھار بیٹھونگی

{"دیوانِ ھاشمیؔ" مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ ص: ۴۴۴۔۴۴۵ ناشر: ادارہ ء اَدبیاتِ اُردو۔ ۱۹۶۱ء حیدرآباد۔}

ہاشمی کی اس غزلِ مسلسل کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہاشمی نے ریختی غزل کے ذریعے عورتوں کے مختلف جذبات واحساسات کی ترجمانی بڑے ہی دل کش انداز میں کی ہے۔ اِن غزل ہائے مسلسل میں صنفِ نازک کے بنیادی جذبات واحساسات کو بڑے ہی گہرے نفسیاتی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اِس میں سادگی ہے، ایک معصومیت ہے، ایک بھولاپن ہے اور یہی اِس کی خوبی ہے۔

دیوانِ ہاشمی میں ایسی اور کئی غزلیں ملتی ہیں، کہیں کہیں ریختی کی صورت میں بھی جن کو پڑھ کر ہاشمی کی فن پر قدرت، حسن وعشق سے غیر معمولی آگہی اور شعروادب کی روایات سے ہم آہنگی کا اِظہار ہوتا ہے۔

● **معظّم بیجاپوری:** بیجاپور کے جن شاعروں نے کم شعری سرمائے کے باوجود دکنی شاعری میں بلند نام پایا ہے، اُن میں ایک معظّم بیجاپوری بھی ہیں۔ معظّم بیجاپوری کی چند ایک نظمیں اور قصیدے عام طور پر ملتے ہیں۔ ابوالنصر محمد خالدی نے معظّم کے کلام اور اُس کے حالاتِ زندگی کے خصوص میں کافی کوشش کی ہے۔ کلامِ معظّم بیجاپوری کی اِشاعت سے معظّم کا کلام تفصیل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ اِس سلسلے میں کہنے کی ضرورت نہیں کہ معظّم کی غزلیں بھی عام دکنی غزلوں کی طرح موضوعات کے اعتبار سے روایتی اور زبان کے اعتبار سے بیجاپوری دکنی کا نمونہ ہیں۔ چوں کہ اِن شاعروں نے محبوب کے سراپا اور اُس کے اَنداز اور اداؤں ہی کو اپنی غزلوں میں زیادہ تر پیش کیا ہے، اسی لیے بعض غزلوں میں غزلِ مسلسل کی کیفیت ملتی ہے۔ معظّم نے نہایت عمدگی کے ساتھ غزلِ مسلسل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً درجہ ذیل غزلِ مسلسل پیش ہے ملاحظہ فرمائیں:

پیارے کی جدائی سے مجھے گھر دار نئیں بھاتا
نہ مجھ کو کام خوش لگتا سگل سنسار نئیں بھاتا
سکیاں سب دل بہلانے کو مرے گفتار ہیں کرتیاں
مٹھّیاں باتاں بوریاں لگتیاں سو او گفتار نئیں بھاتا
مجھے اَبرن پینے سوں سینے میں آگ لگتی ہے
لگانا تن کو خوش بوئی پھولوں کا ہار نئیں بھاتا

مضامین

رکھی ہوں پوت کالی میں نشانی ہے سہاگن کی
مِسّی داتوں کو لانا اور یہ سنگار نئیں بھاتا
{"کلامِ معظمؔ بیجاپوری" بہ تصحیح و تقدیم ابوالنصر محمد خالدی ص : ۳۲ ۔ ۳۳ ۔ سنہ اشاعت: ۱۹۸۵ء ۔}

معظمؔ نے یہ غزل ریختی کے پیرائے میں کہی ہے جس میں محبوبہ کی طرف سے جذباتِ عشق کا اِظہار کیا گیا ہے۔ محبوبہ عاشق سے جدائی کے زمانے کی کیفیات کو نہایت پُر اَثر اور پُرسوز اَنداز میں بیان کرتی ہے۔ عاشق کی جدائی نا قابلِ برداشت ہے اور عالمِ ہجر میں کہیں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی ،کوئی بات خوش نہیں آتی ،کہیں دل نہیں لگتا اور طبیعت اُچاٹ رہتی ہے۔

محبوبہ کہتی ہے عاشق کی جدائی کی وجہ سے اُسے گھر دار اچھا نہیں لگتا، نہ کوئی کام اچھا معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی چیز پسند آتی ہے۔ یہاں تک کہ سہیلیاں دل بہلانے کے لیے دنیا بھر کی باتیں کرتی ہیں۔لیکن میٹھی باتیں بھی اچھی معلوم نہیں ہوتی اور نہ اندازِ گفتار پسند آتا ہے۔ عاشق کی جدائی میں سینے میں آگ لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، نہ تن کو خوشبو بھاتی ہے اور نہ پھولوں کا ہار پسند آتا ہے۔ میں نے سہاگن کی نشانی سمجھ کر کالی پوت اُٹھا رکھی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ دانتوں کی مسی لگانا پسند ہے اور نہ کوئی سنگھار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب سے میرے محبوب (قادرشاہ) نے مجھ سے غیروں جیسا سلوک شروع کیا اور تغافل سے پیش رہے ہیں۔ مجھ کو بھی آج تک کسی کا پیار گوارا نہیں ہوا۔

تہذیب وتمدن کی ترقی اور فروغِ دکنی شعروادب میں دکن کی دو سلطنتوں کو ہندستان کی تاریخ میں اِمتیازی مقام حاصل ہے۔ جن میں ایک گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت اور دوسری بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت ہے۔ یہ دونوں سلطنتیں اُردو کی قوی سرپرستی کررہی تھیں کہ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۸۷۔۱۶۸۶ء میں اِن پر قبضہ کرلیا اور بہت دنوں تک آزاد رہنے کے بعد دکن کی یہ ریاستیں پھر ایک بار دِلّی کے ماتحت ہوگئیں۔ حالات بدل گئے مگر شعروشاعری کا چرچہ ختم نہیں ہوا، دکن نے شمالی ہند پر اپنا اَثر ڈالا اور شمالی ہند کی زبان نے دکن کو بہت کچھ دیا۔ اِس عمل اور ردِّعمل سے لسانی اور شعری واَدبی نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جب دکن کی ریاستیں مغلیہ حکومت کا حصہ بن گئیں ، اُس وقت بھی جو لوگ شاعری کررہے تھے، اُنھوں نے شاعری کے اِس چراغ کو بجھنے نہیں دیا بلکہ مختلف شعری اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہوئے شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر سہی غزل کے ساتھ ساتھ غزلِ مسلسل بھی کہتے رہے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر جعفر جری
پرنسپل یونیورسٹی کالج آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسس،
ساتاواہنا یونیورسٹی
کریم نگر 505002 (تلنگانہ اسٹیٹ) اِنڈیا۔

❖❖❖

مضامین

محمد مصطفیٰ علی سروری

مابعد کووڈ میڈیا کا منظر نامہ

کرونا وائرس کی وباء نے نہ صرف اقوام اور ممالک میں عوام کی صحت کو متاثر کیا ہے بلکہ اس کے اثرات زندگی کے مختلف شعبہ جات میں بھی مرتب ہورہے ہیں اور ذرائع ابلاغ کو بھی اس سے استثنیٰ نہیں ہے۔ حالانکہ کرونا کی وباء کے سبب لوگوں کی جانب سے ذرائع ابلاغ کا استعمال بڑھا ہے۔ بلکہ ان کی اثر پذیری میں اضافہ دیکھا گیا ہے۔ کئی میڈیا کے اداروں نے اپنے قارئین اور ناظرین کی تعداد میں اضافہ ریکارڈ کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف معاشی محاذ پر اشتہارات کے کم ہوجانے سے مختصر مدتی اور طویل مدتی اثرات پڑنا شروع ہوگئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ذرائع ترسیل عامہ وابلاغ کے لیے خطرات پیدا ہوگئے ہیں۔

ان حالات میں ذرائع ترسیل و ابلاغ کے ادارے اپنی ترجیحات بدلنے پر مجبور ہوگئے جس میں اخراجات کو کم کرنے کے مختصر مدتی اوطویل مدتی منصوبے شامل ہیں۔

روایاتی ذرائع ترسیل و ابلاغ جس میں اخبارات سب سے آگے ہیں' کو درپیش چیالنجس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ افریقہ کے ملک کینیا میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی شرح 87 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ (بحوالہ Internet World Stats)

خبر رساں ادارے رائٹرس نے اپنی ڈیجیٹل نیوز رپورٹ میں بڑے دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔ دنیا بھر میں سروے کرنے کے بعد اس رپورٹ میں بتلایا گیا کہ کرونا وائرس سے پیدا ہونے والے بحران کے سبب دنیا کے کئی ممالک میں روایاتی مین اسٹریم میڈیا پر انحصار میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن نیوز کے ساتھ ساتھ آن لائن نیوز کے صارفین میں بہت زیادہ اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ رائٹرس کے سروے میں شریک لوگوں کی اکثریت نے بتلایا کہ ٹیلی ویژن ان کے لیے خبروں کے حصول کا اصل ماخذ بن گیا ہے۔

ورقی صحافت یعنی اخبارات کے لیے لاک ڈاؤن کے دوران خریداروں میں اچانک گراوٹ آگئی جس میں لاک ڈاؤن کی پابندیوں اور دیگر غیر مصدقہ اطلاعات نے بھی اہم رول ادا کیا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ اخبارات کے ذریعہ بھی کرونا وائرس پھیل سکتا ہے۔ اس پس منظر میں ٹیلی ویژن کے گھٹتے ہوئے ناظرین کی تعداد اچانک بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک میں آن لائن

میڈیا اور سوشیل میڈیا کے صارفین کی تعداد میں بھی اس عرصے کے دوران کافی اضافہ ہوا۔

دنیا بھر میں واٹس ایپ کے صارفین میں سب سے زیادہ اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ بعض ملکوں میں دس گنا اضافہ کی شرح رہی۔

اپریل 2020ء تک بھی کوویڈ- 19 کے کوریج پر عوام کی بڑی تعداد مطمئن تھی۔ مین اسٹریم خاص ٹیلی ویژن کے حوالے سے رپورٹ میں بتلایا گیا کہ سوشیل میڈیا کے مقابل اس پر عوامی بھروسہ بڑھا ہے۔ کرونا وائرس کی وباء سے ہٹ کر اگر رائٹرس کے سروے رپورٹ کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ غلط اطلاعات کی ترسیل کے حوالے سے انٹرنیٹ پر عوامی اعتماد کم اور خدشات بہت زیادہ تھے۔ عوام کی بڑی تعداد نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ غلط اطلاعات پھیلانے میں سب سے بڑا ہاتھ سیاست دانوں کا ہے اور فیس بک کا استعمال کرنے والے حضرات خاص طور پر اس بات کو نوٹ کریں کہ غلط اطلاعات کی ترسیل کے لیے فیس بک کے پلیٹ فارم کا سب سے زیادہ استعمال ہو رہا ہے۔ جبکہ دنیا کے بعض ملکوں میں واٹس ایپ سب سے زیادہ غلط اطلاعات کی ترسیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ترسیل عامہ وصحافت کے طلبہ کے لیے یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ دنیا کے کئی ممالک میں مقامی اخبارات اور ان کی جانب سے چلائی جانے والی ویب سائٹس خبروں کے حصول کا علاقائی سطح پر ایک ذریعہ ہیں لیکن ان کا مقابلہ فیس بک اور سوشیل میڈیا کے ایسے گروپس سے ہے جو کہ علاقائی سطح پر خبریں پہنچانے کا کام کر رہے ہیں جس کی وجہ سے مقامی اخبارات اور خبر رساں اداروں کے لیے چیالنجس بڑھ گئے ہیں۔ خبروں کے حصول کے لیے ویب سائٹس اور ایپ کا استعمال بھی پچھلے کے مقابل 28 فیصدی بڑھ گیا ہے۔

اپنے قارئین اور صارفین سے مضبوط تعلقات استوار کرنے کے لیے اخبارات اور میڈیا ادارے موبائل فون کے پیغامات اور ای میل کا بھی سہارا لے رہے ہیں۔

کرونا وائرس سے پیدا شدہ بحرانی حالات میں عوام کا روایاتی ذرائع ترسیل وابلاغ پر بھروسہ بڑھا ہے۔ گذشتہ نو برسوں کے دوران کیے جانے والے سروے میں ہمیشہ آن لائن نیوز فراہم کرنے والے ذرائع ٹیلی ویژن کے مقابل سبقت لے جا رہے تھے لیکن کرونا وباء کے دور میں ٹیلی ویژن نیوز چیانلس کے ناظرین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ ماہرین اس اضافہ کے رجحان کو عارضی قرار دے رہے ہیں لیکن ٹیلی ویژن کے سرکاری نیوز چیانلس کی ناظرین کی تعداد میں بھی اضافہ درج کیا گیا اور تشویش کی بات پرنٹ جرنلزم کے لیے یہ رہی کہ اس کے قارئین کی تعداد بدستور گرتی جا رہی ہے اور سوشیل میڈیا کے استعمال کرنے

مضامین

والوں کی تعداد اچانک بڑھنے کے بعد ٹھیراؤ کی کیفیت میں ہے۔

برطانیہ میں اخبارات کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے والوں کا اپریل 2020ء میں فیصد صرف 18 ریکارڈ کیا گیا جبکہ 79 فیصد شہری آن لائن ذرائع 71 فیصدی شہری ٹیلی ویژن کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے والوں کا فیصد صرف 16 رہا جبکہ اسی عرصے کے دوران 73 فیصدی لوگ آن لائن میڈیا اور 60 فیصدی امریکی لوگ ٹیلی ویژن کے ذریعہ خبریں جان رہے تھے۔

رائٹرس کے عالمی سروے میں 40 ممالک کو شامل کیا گیا تھا۔ اس سروے کے نتائج میں بتلایا گیا کہ 56 فیصدی رائے دہندگان انٹرنیٹ پر اصل خبروں اور جھوٹی خبروں کے حوالے سے فکرمند ہیں۔

کرونا وائرس کی وباء سے ذرائع ترسیل وابلاغ پر پڑنے والے مکمل اثرات کے بارے میں کچھ بھی کہنا فی الحال قبل از وقت ہوگا لیکن یہ بات توطئے ہے کہ اب میڈیا کے میدان میں کارکرد اداروں کے لیے اپنی پالیسیوں میں اور ترجیحات میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ جن اخبارات نے اپنے آپ کو نئی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ڈیجیٹل پراڈکٹ (ای پیپر-ڈیجیٹل ایڈیشن) کے لیے ادائیگی کو لازمی کرلیا وہ اپنے پرنٹ ایڈیشن کے نقصانات کو کسی حد تک کنٹرول کرسکے۔

The Tampa Bay Times فلوریڈا کا ایک مشہور اخبار ہے۔ اس اخبار سے ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کس قدر شدید متاثر ہوا ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس امریکی اخبار نے ابھی تک عالمی میدان صحافت کا مشہور اعزاز پلٹزر انعام (Pulitzer Prize) 12 مرتبہ حاصل کیا ہے۔ Paul Tash اس اخبار کے چیئرمین اور سی ای او ہیں۔ انہوں نے Poynter.org کو انٹرویو دیتے ہوئے بتلایا کہ جیسے ہی معاشی بحران کی سنگینی کا احساس ہوا تو ہم نے اس سے نمٹنے کے راستے تلاش کرنا شروع کئے۔ ہم نے اخبار کے پرنٹ ایڈیشن کو صرف انہی دنوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا جن دنوں اخبار عوام میں بہت زیادہ مقبول ہو۔ ان کے مطابق اخبار کے لیے اشتہارات کی آمدنی میں 50 فیصدی کمی آگئی ہے اور 45 برسوں کی تاریخ میں اخبار پہلی مرتبہ اس طرح کے اقدامات کرنے کے لیے مجبور ہوگیا۔ (بحوالہ۔ Poynter کی رپورٹ 30/مارچ 2020)

آسٹریلیاء میں بھی کرونا وباء سے پیدا شدہ صورت حال میں معاشی مسائل کے سبب 60 اخبارات کی اشاعت مسدود ہوگئی۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ برطانوی میڈیا میں برسرکار ایک تہائی صحافی اپنی ملازمت سے کوئڈ 19 کے سبب پیدا شدہ معاشی مسائل کے سبب

مضامین

محروم ہو سکتے ہیں۔

کرونا وائرس کی وباء سے ہمارے ملک میں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے اخبارات کو عوامی خدشات کو دور کرنے کے لیے اشتہارات کا سہارا لینا پڑا کہ اخبار کے ذریعہ سے کرونا وائرس نہیں پھیلتا ہے۔ ممبئی کے کئی ریسڈنشیل کالونیوں میں اخبارات کی تقسیم پر سوسائٹی والوں کی پابندی کے خلاف اخبار ٹائمز آف انڈیا نے باضابطہ قانون داں حضرات کے انٹرویوز شائع کیے کہ اخبارات کی ہوم ڈیلیوری کو روکنا قانوناً جرم ہے۔ اخبار اکنامک ٹائمز نے اپنے اخبار کے Mast head کے نیچے جلی حروف میں لکھنا شروع کیا کہ اخبار ہاتھ میں لے کر پڑھنا پوری طرح محفوظ ہے۔

اخبارات میں جیاکٹ ایڈورٹائزمنٹ، ہاف پیج اور کوارٹر پیج کے اشتہارات بند ہوگئے۔ کئی مقامات پر خود اخبار کے ہاکرس نے لاک ڈاؤن کے آغاز میں اخبارات کی تقسیم بند کردی۔ کئی اخبارات میں ہفتہ واری اور روزانہ کے سپلیمنٹس کی اشاعت روک دی گئی۔ اخبار ہندوستان ٹائمز کے انتظامیہ نے روزانہ ساڑے تین کروڑ کا نقصان ہونے کی اطلاع دی۔ اردو اخبارات کو بھی کرونا کے معاشی بحران سے کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ لاک ڈاؤن کے آغاز میں ہی کئی اخبارات کو اپنی طباعت مسدود کردینا پڑا کیونکہ کئی مقامات پر نہ تو ایجنٹ ہی اخبار لے رہا تھا اور نہ ہی ہاکرس موجود تھے۔ کچھ وقفہ کے بعد جب اردو اخبارات کی اشاعت بحال ہوئی تو اشتہارات بالکل ختم ہوگئے تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے پہلے تو اخبار کے صفحات کم کردینے کا رجحان رہا۔ پھر روزانہ کے خصوصی سپلیمنٹس بند کردیئے گئے۔ اتوار کا ایڈیشن بھی کم صفحات کا کردیا گیا۔

اب مابعد کوویڈ-19 صورتحال سے نمٹنے کے اردو اخبارات کو بھی دیگر اخبارات کی طرح فوری اور طویل مدتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ تاکہ کرونا وباء سے پیدا ہونے والے بحران سے باہر نکل آنے کا سہولت بخش راستہ مل سکے۔ کیا اس امتحان میں اردو اخبارات کامیاب ہوں گے اس کا درست جواب آنے والا وقت ہی دے سکے گا۔

☆☆☆

محمد مصطفیٰ علی سروری
اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ ترسیل عامہ وصحافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد۔500032 (تلنگانہ)

**رشتوں کی خوب صورتی ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنے میں ہے
بے عیب انسان تلاش کروگے
تو اکیلے رہ جاوگے**

اے۔آر۔منظر

فاطمہ تاج کی غزل گوئی

حیدرآباددکن میں 1952ء کے قریب کئی شاعرات نے شعروسخن کی محفل میں قدم رکھااوروہ اپنی شہرت کی بلندی پرپہنچیں توکئی رہ روکی حیثیت سے رہ گئیں۔اس قافلے میں شامل شاعرات کے کلام میں جدیدیت اورروایت پسندی دونوں رنگوں کا امتزاج پائے جاتے ہیں۔ان شاعرات میں شفیق فاطمہ شعریٰ، بشیرالنسا، روحی علی اصغر،نایاب سلطانہ، تہنیت النساء بیگم، رضیہ بصیر،عظمت عبدلقیوم،خورشید نظر، اشرف رفیع ،بانو طاہرہ سعید، زبیدہ رعنا ،تسنیم جوہراور فاطمہ تاج وغیرہ شامل ہیں۔

معروف شاعرہ فاطمہ تاج جنوبی ہند کی خاتون شاعروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ان کی شعری اور نثری تخلیقات اردو کے تقریباً اکثروبیشتر رسائل وجرائد میں زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ان کی اب تک شائع ہونے والی تخلیقات کچھ یوں ہیں:

''اب کے برس''آس پاس''امانت''دلاسہ''وہ' خوشبوئے غزل''حوصلہ''پھول غزل کے''چھاؤں کی چادر' 'دھوپ کی کلیاں''ایک چراغ اور''من مانی''ہیرے بھی پتھر' وغیرہ۔اس کے علاوہ''دیوان تاج''کے نام سے ایک مجموعہ ہے جس میں ان کے سارے کلام کو یکجا کردیا گیا تھا۔اس کی اشاعت ہونے والی تھی کہ محترمہ کا انتقال ہوگیا اور آج تک دیوان تاج کی اشاعت التوا میں رہ گیا۔ان کے استاد ڈاکٹر عبدالغفار خان کے بقول''فاطمہ تاج چھ برس کی عمر میں شعر موزوں کرتی تھیں۔''

تاج فاطمہ نے فکروخیال کی بے شمار رنگینیاں دکھائی ہیں۔انہوں نے قلم کی نوک کا خوبصورت استعمال شعرکوتراشنے میں کیا ہے۔چاہے وہ حمد ہو،نعت ہو،غزل ہو یانظم فاطمہ تاج نے صنف ادب میں ندرت بیان سے گلکاریاں کی ہیں۔ویسے تو بنیادی طور پرغزل کی شاعرہ ہیں اوراپنے آپ کوبھی غزل کی شاعرہ تسلیم کرتی تھیں۔فاطمہ تاج نے جوبھی شاعری کی ہے وہ فطرت اورطبعی میدان کے مطابق ہےاوروجدانی کیفیت کی اساس پرقایم ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثرآفرینی پائی جاتی ہے۔ ہر چندان کا انداز بیاں یکسرسلاست روانگی اور سادگی سے پُر ہےلیکن تخیل اورفکرکی پروازاپنی آغوش میں آفاقیت سا انداز رکھتی ہے۔انہوں نے شعرکہنے میں خوب سے خوب تر کی تلاش والا معاملہ برتا ہے۔اشعارملاحظہ ہوں:

تھوڑی فرصت اور ملے تو بات بڑھے گی آگے
بات ہماری ختم ہوئی دل کا قصہ باقی رہ گیا

ooo

اندھیری رات کا سناٹا اور تنہا
اب اس کے بعد سحر ہے یقین نہیں آتا

ooo

فصل گل مجھ کو دیتے ہیں
پاؤں میں کانٹے سر پہ دھول

مضامین

لیکن میں نے خواب میں دیکھا
ہاتھ میں میرے پھول ہی پھول

فاطمہ تاج حیدرآباد کی ان چنندہ خاتون شاعرات میں سے ہیں جنہیں ملک اور بیرون ملک کی سطح پر اعتبار حاصل ہے۔ وہ نسوانی احساسات کی بھرپور تائید کے ساتھ ان کی نمائندگی کرتی تھیں۔ تانیثیت کے پیچ وخم سے خوب واقف تھیں اوران کے لیے اپنے اشعار میں آواز بھی بلند کی ہے۔ درج ذیل اشعار میں یہ دیکھا جاسکتا ہے:

درد کا دریا پار کیا ہے یاد کا صحرا باقی ہے
جتنا رستہ چل کر آئے ہیں اتنا رستہ باقی ہے
تیرا میرا ماضی بچھڑے ایک زمانہ بیت گیا
اب دونوں ساتھ نہیں ہیں پھر بھی رشتہ باقی ہے

ooo

لے کر پیام زندگی پھر آگئے ہیں آپ
چپ ساعت حیات ہماری زندگی گزر گئی

ooo

ساحل پہ آگئی ہوں لیکن یہ سوچتی ہوں
آخر وہ کون تھا جو کشتی ڈبو رہا تھا

اردو شاعری کی بات کی جائے تو اس میں غزل کو سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے غزل کی بہترین کیفیت یہ ہے کہ اس کے ایک شعر میں جہاں معانی آباد ہوتے ہیں۔ ایک داستان کو سمیٹنے کی قوت رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں لاتعداد شاعر پیدا ہوئے اور اپنی شاعری سے معاشرے کے ساتھ ساتھ فرد کو متاثر کیا۔ ان میں سے کئی ایک شاعر اپنے کلام سے انقلاب برپا کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ ان میں چند شعراء نے شاعری کے میدان کار زار میں جوش دلانے ولولہ بھرنے کے لیے کارآمد فکر پیدا کی ہے۔ اسی طرح سماج اور سوسائٹی کی نباضی کرنے والی شاعرات میں سے ایک فاطمہ تاج ہیں جن کا کلام زندگی اور زندگی کے حوالے سے پیدا ہونے والی رنگ رلیاں اور آزمائش ومحن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ان کا کلام اپنی ذات سے ہم کلامی، نصیحت، امنگ اور جینے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے:

نقش وفا ہم ہی ہیں ہم ہی حرف آرزو
ہر جا عیاں رہیں گے منانے کے باوجود
اب تک بھی تاج سر کہیں اپنا نہ جھک سکا
بارِ غمِ حیات اٹھانے کے باوجود

درحقیقت فاطمہ تاج غزل کی شاعرہ ہیں۔ ان کے زیادہ تر مجموعے غزلیات پر مشتمل ہیں۔ اس میں بھی پیار و محبت کے اشعار بھرے پڑے ہیں جن کی قرات سے جہاں رومانیت کا احساس ہوتا ہے تو وہیں تانیثیت کا فرحت انگیز خیال بھی درآتا ہے۔ پیار وعشق کی کٹھن راہوں کو طے کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ محبت میں حائل کھٹن اور دشوار گزار راہوں کو محبت کے جذبات سے لبریز شخص ہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس حقیقت اور کلیہ کو سامنے رکھیں تو فاطمہ تاج کے کلام پہ رشک ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں عورت کی طرف سے محبت میں پیش قدمی کا اظہار اور مرد کی نظریں ملتفت نہ

مضامین

ہونے پر شکایت اور اپنے اوپر بیتنے والی کیفیت کا اظہار بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہمیشہ موسم شبنم رہا آنکھوں میں
تیرا خیال بھی پرنم رہا آنکھوں میں

ooo

دیتے ہیں لوگ جذبوں کو جب دوستی کا نام
ہوتی ہیں کتنی تلخ وہ سچائیاں نہ پوچھ

ooo

جس انقلاب کا ہے انتظار دنیا کو
وہ انقلاب میرے دل میں پل رہا ہے ابھی

فاطمہ تاج کی شاعری کے مطالعے سے لگتا ہے کہ ان کے دل کے اوراق پر انگنت کرچیاں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اندر کرچیوں کو سمیٹنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ سمجھیں تو ان کرچیوں سے کھیلنے کی قوت اور ہمت بھی ان کے اندر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ سماج اور معاشرے میں پھیلی برائی، بے وفائی، مردوں کی بالادستی ازدواجی زندگی کی خراشیں، انہیں زندگی بسر کرنے کا ہنر سکھا جاتی ہیں۔ ساتھ ہی شاعرہ کو اپنے ہونے کا ایقان اور اس پر صبر وضبط کا عرفان ان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اسی کو اپنی حیات مستعار کی کمائی اور ثمرہ جانتی ہیں۔ اپنے وجود میں کتنی گہرائی رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کی غزلوں سے کیا جا سکتا ہے اور نظموں میں بھی اس رنگ کی شاعری بہت عمدہ اور بہترین پائی جاتی ہے۔ چونکہ اپنی نگاہ تفہیم غزل تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں اس لیے غزل کے حصار میں ہی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔ یقیناً فاطمہ تاج فطری شاعرہ ہیں ان کے یہاں ہر طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کے مجموعے کلام کے سلسلوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کے نظمیہ کلام کی کیفیت اور روانی شعر سے نظموں کی نظمیت سے اندازہ کر سکتے ہیں، ان میں سے چند بند آپ کی نظروں کے سامنے رکھتا ہوں تا کہ ان کی نظم نگاری کے تعلق سے ایک جھلک آپ کے پردہ سمیں پر آجائے۔ نظم ''آؤ اندازہ کریں'' یہ بند دیکھیے:

ایک دفعہ ہم بھی الجھ کر رگ جاں سے دیکھیں
چین ملتا ہے یا پھر چیختے پل ملتے ہیں
جذبے سمجھے ہیں یا رشتے ہیں ذرا دیکھ تو لیں
آؤ اندازہ کریں یہ رشتوں کی مضبوطی کا

فاطمہ تاج نسوانی نے آواز جذبات اور احساسات کی بہترین نمائندگی کی ہے۔ ان کی شاعری قادرالکلامی کی عکاسی ہے۔ اس کے باوجود ان کے پاس کمزور اشعار بھی ہیں۔ بعض اشعار اتنے اثر انگیز اور بے ساختہ ہیں کہ دل تک اتر جاتے ہیں۔ جس میں ان کے شاعرنہ رموز کا بھرپور خلوص اور رنگ وفا شامل ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خلوص میں تو کبھی دوریاں نہیں ہوتیں
ہزار فاصلے ہوں پھر بھی رابطہ رکھنا
یہ دل کا مقام ہے یہاں کوئی نہیں رہتا
مدت سے یہ ویران ہے معلوم نہیں کیوں

فاطمہ تاج نے اپنی شاعری میں رومانیت کے

ساتھ روایت پسندی کو بھی اچھی جگہ دی ہے۔ان کی شاعری کا اہم حصہ حسن و نگاہ کے تذکرے دلی کیفیات اور واردات کا بیان ہے۔ان کی شاعری میں نوحہ گری کی حکایات کم کم ہیں۔ ہاں گلے شکوے اور یاسیت کے اشعار ہیں۔اس میں بھی کہیں کہیں گلے شکوے زیادہ ہیں تو کہیں خوداعتمادی اور خودداری کا اخلاص بہتر طریقے سے پائے جاتے ہیں۔کہیں مجنوں سا جنوں بھی ہے تو کہیں سحرانوردی کا انداز ہے۔کہیں پندو نصائح بھی ہیں تو کہیں پر دلاسہ اور صبر و رضا بھی ہے۔کہیں دیدار کی طلب ہے تو کہیں بے وفائی کا تذکرہ۔کہیں بے التفاتی محبوب کا ذکر بھی ہیں تو کہیں بوس و کنار کی بے پروائیاں وغیرہ۔ غرض فاطمہ تاج کے کلام میں عمدگی اور بالیدگی کا جیتا جاگتا شعور ملتا ہے جو فن کے ساتھ رواں ہے:

مغرور بہت رہتا ہے جو ذات پہ اپنی
وہ مجھ سے پشیمان ہے معلوم نہیں کیوں
یہ دل کا مکان ہے یہاں کوئی نہیں رہتا
مدت یہ ویران ہے معلوم نہیں کیوں
میں نے سوچا ہی نہ تھا عمر کے دوراہے پر
بچھڑے لوگوں سے ملاقات بھی ہوسکتی ہے

فاطمہ تاج رسمی شہرت سے دور، شعر و سخن کی بے جا جی حضوری، انا اور برتری کی خاطر کسی قسم کی چپقلش بازی نہیں کی، نہ اپنی برتری جتانے کے لیے کسی کے در کو نوک کی بلکہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنی نسوانی پاسداری کو قائم رکھتے ہوئے پردہ نشیں رہیں جو ایک عورت کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ان کی نظم ''نغمہ نشاط'' سے دو بند دیکھئے:

آوارہ بگولوں کی اکثر
میں خود ہی تواضع کرتی ہوں
مٹی کی صراحی میں بھر کر
پانی بھی پلایا کرتی ہوں

ooo

پر سوز صدا میں گاتی ہوں
میں بنت عرب ہوں بنت عرب
مر کر بھی جو زندہ رہتی ہے
دنیا میں نہیں، دل ہی میں سہی

فاطمہ تاج کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں مختلف اداروں انجمنوں نے ایوارڈوں اعزازات سے نوازا ہے۔جن میں اتر پردیش اردو اکیڈمی، اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایوارڈ، آل انڈیا میرا کیڈمی کی جانب سے امتیاز میر ایوارڈ، تلنگانہ اردو اکیڈمی نے بھی ان کے کئی شعری مجموعوں پر مختلف موقعوں پر ایوارڈ دیے ہیں،۔ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے مدر ٹریسا ایوارڈ عطا کیا۔آندھرا پردیش لینگویج کمیشن نے بھی انہیں باوقار ایوارڈ سے نوازا ہے۔

☆☆☆

اے۔آر۔منظر
اسکول آف ہمانیٹیز، یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد۔500046
Mob.No. 9848956103

مضامین

سراج اورنگ آبادی کی غزلوں میں عشقِ حقیقی کا تصور

صنفِ غزل عام طور پر عشقیہ جذبات کی ہی غمّازی کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غزل کے دامن میں عشق کے علاوہ دوسرے مضامین سموئے نہیں جا سکتے یا سموئے نہیں جاتے ہیں۔ رہی بات عشق کی تو عشق کو حقیقی اور مجازی کے خانوں میں تقسیم کر کے غزل کے مزاج کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ولؔی اورنگ آبادی نے کہا تھا:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

(ولؔی اورنگ آبادی)

دراصل اردو غزل میں عشقِ حقیقی کا تصوّر خود اس کی ابتدا سے ہی موجود ہے۔ شعرائے دکن نے غزل میں جہاں دوسرے مضامین اور موضوعات کو برتا ہے وہیں عشقِ حقیقی کے مضامین کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دے کر غزل کے دامن کو اس قدر وسیع کر دیا کہ شمالی ہند کے شاعروں کو فارسی کی شاعری ترک کر اردو کا دامن تھامنا پڑا۔ فخر الدین نظامؔی بیدری سے لے کر سراؔج اورنگ آبادی تک سینکڑوں شعراء پیدا ہوئے لیکن سراؔج کا ذکر ان غزل گو شعراء میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے فن سے ادب میں اپنی قامت کو برقرار رکھا اور جن کا ادب آج تین سو سال بعد بھی اسی آب و تاب سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے جیسا اس دور میں تھا۔

قاضی سلیم اپنے ایک مضمون "سراج اورنگ آبادی کی شاعرانہ عظمت" میں رقمطراز ہیں کہ:

"اردو شاعری کی تاریخ میں شاہ سراج اورنگ آبادی کئی حیثیتوں سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں وہ ولی دکنی کے بعد نہ صرف دکنی غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں بلکہ تمام اردو کے اعظیم المرتبت شعراء کی صفِ اوّل میں ہر اعتبار سے جگہ پانے کے مستحق ہیں"۔۔۔قاضی سلیم

[بحوالہ سراج اورنگ آبادی: شخصیت اور شاعری، مولّفہ شمامہ پروین]

سراؔج دکن کے عظیم المرتبت شاعروں کی آخری کڑی تھے یعنی کلاسیکی غزل گوئی کی وہ بہترین روایت جس کے علمبردار فیروؔز، قلؔی قطب شاہ، حسن شوؔقی اور ولؔی اورنگ آبادی وغیرہ تھے، سراؔج پر ختم ہوئی۔ سراؔج کے متعلق ڈاکٹر محی الدین قادری زوؔر اپنی کتاب "دکنی ادب کی تاریخ" میں رقمطراز ہیں کہ:

''شاہ سراؔج اورنگ آباد کے آخری بڑے شاعر تھے اور انہیں کی ذات پر دکن کے قدیم استادانِ فن اور معمارانِ سخن کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے اکثر شاعروں کی طرح کسی سرکاری یا درباری قدردانی کی کوشش نہیں کی"

مضامین

(دکنی ادب کی تاریخ۔ص ۱۳۱) ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ۔

مغل بادشاہ فرّخ سیر کے زمانے میں سراجؔ کی ولادت ۲۱ مارچ ۱۷۱۲ء میں اورنگ آباد میں ہوئی اور ۱۶ اپریل ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اورنگ آباد میں ہی انتقال ہوا۔ محض ۵۲ سال کی عمر میں انہوں نے وہ کچھ لکھ دیا جس کے لئے کئی عمریں درکار ہوتی ہیں ۔ گرچہ سراجؔ کا زمانِ شاعری سیاسی طور پر خلفشار و تصادم کا زمانہ تھا جہاں ایک پائیدار حکومت زوال پذیر ہو رہی تھی اور ایک نئی حکومت اپنے پاؤں جما رہی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سراجؔ کی شاعری پر اس دورِ پر آشوب کی نفرت کے بجائے عشق اور والہانہ محبت کا درس ملتا ہے۔ شاید یہی سراجؔ کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

سراجؔ کی شاعری کا آغاز ۱۲ یا ۱۳ سال کی عمر میں ہوا۔ اور عمر کے ۱۳ ویں سال میں ان پر جذب و بیخودی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ حالت تقریباً ۵ یا ۶ سال تک قائم رہی۔ بیخودی کے اس عالم میں وہ حضرتِ برہان الدین غریب کے مزار پر پڑے رہتے تھے اور ان کی زبان سے بے شمار اشعار ادا ہوتے تھے۔ خود سراجؔ کا قول ہے کہ اگر وہ اشعار جمع کیے جاتے تو ایک ضخیم کلّیات ہوتا۔ سراجؔ کا دیوان عبد الرسول خان نے ۱۷۳۹ء میں ان کی زندگی میں ہی ترتیب دیا۔ کلّیاتِ سراج کو سر عبدالقادر سروری نے ترتیب دیا اور اس کتاب کو ۱۹۴۰ء میں ایک مقدمے کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کروایا۔ اسی نسخے کے عکسی ایڈیشن کو ۱۹۸۲ء میں ترقی اردو بیورو (نئی دہلی) نے چھاپا۔

کلّیاتِ سراج کے مطالعے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ سراج نے نہ صرف غزلوں پر ہی اپنی طبع آزمائی بلکہ مروجہ تمام اصنافِ سخن مثلاً مثنویات، قصائد، فردیات، مخمسات، حمد، نعت، منقبت اور مناجات وغیرہ پر بھی زور آزمایا۔ اور مثنوی ''بوستانِ خیال'' ان کی شاعرانہ قادرالکلامی کا بین ثبوت ہے۔ لیکن قارئینِ ادب کے لئے ان کی غزلیں ہی خصوصی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ یہاں قارئین کو یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ان سطور میں نا ہی سراجؔ اور نگ آبادی کی کل شاعری کا احاطہ مقصود ہے اور نہ ان کی تمام غزلیات کا تجزیہ مراد ہے بلکہ یہاں سراجؔ کی صرف انہی غزلوں پر روشنی ڈالی جائے گی جن میں عشقِ حقیقی کی کارفرمائی نظر آتی ہے

سراجؔ ایک فطری شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری دماغ سے نہیں بلکہ دل سے کی ہے۔ وہ ریاضِ سخن سے فنکار نہیں ہوئے تھے تاہم ان کی شاعری پر ولّی اورنگ آبادی سے استفادے کا رنگ ضرور جھلکتا ہے اور اس کا اقرار سراجؔ خود کرتے ہیں کہ:-

تجھ مثل اے سراجؔ بعدِ ولّی
کوئی صاحبِ سخن نہیں دیکھا

ولّی اورنگ آبادی کی طرح سراجؔ کے کلام میں بھی عارفانہ، اخلاقیانہ اور متصوفانہ فکر کی آمیزش ملتی ہے لیکن حسن پرستی سراجؔ کی شاعری کا غالب رجحان تھا۔ سراجؔ کے نزدیک عشق ایک والہانہ جذبہ ہے اور اس میں حقیقت اور مجاز کی کوئی قید نہیں بلکہ وہ تو عشقِ مجاز کو عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا ایک

مضامین

ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ لہٰذا وہ خود رقمطراز ہیں کہ:

ہر گز نہیں ہے اسکو حقیقت کی چاشنی
جس نے مزہ چکھا نہیں عشقِ مجاز کا

سراجؔ کی شاعری پاکیزگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ جب کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے تو اس طرح کے جملوں کی صداقت کے لئے سراجؔ کے کلام کو بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے کلام کی ظاہری پاکیزگی سے ان کے باطنی فکر کی خوشبو آتی ہے۔ وہ بیک وقت صاحبِ دل اور صاحبِ باطن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں مجھے سر عبدالقادر سروری کے ان جملوں کو پیش کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ:-

"سراجؔ نہ صرف حسن پسند نظر رکھتے تھے بلکہ وہ صاحبِ دل اور صاحبِ باطن بھی تھے۔ حسنِ ظاہر کی دلکشیاں انہیں کبھی اتنا محو نہ کرسکیں کہ وہ حقیقت سے بے خبر ہوگئے ہوں۔ ان کے کلام سے جگہ جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے"۔

سر عبدالقادر سروری (مقدمہ کلّیاتِ سراج ص۔۴۳)

سراجؔ کو محض ایک صوفی شاعر کی فہرست میں شامل کرلینا ان کی فنکارانہ حیثیت کی تصغیر کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ صوفی شاعروں میں گنے ضرور جاتے ہیں لیکن ان کے تصوّف کا مزاج ولیؔ اور میر دردؔ سے جدا ہے۔ ولیؔ اور سراجؔ میں بنیادی فرق یہ تھا کہ ولیؔ کی زندگی زیادہ تر صوفیوں کی صحبت میں گزری جبکہ سراجؔ خود ایک صوفی تھے۔ لہٰذا انہوں نے تصوّف اور عشق کے امتزاج سے اپنی شاعری میں ایک انوکھا پن پیدا کیا جس سے نہ تصوّف کو الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ جذبۂ عشق کو۔ ڈاکٹر محمد حسن نے سراجؔ کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"سراجؔ کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے لیکن ان کی شاعری پر تصوّف کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ وہ زندگی کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے ان کے کلام میں حسن پرستی اور والہانہ پن کا ایک انوکھا امتزاج ملتا ہے"

(ڈاکٹر محمّد حسن) (تعارف انتخابِ سراج اورنگ آبادی)

عشق درحقیقت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہمیشہ طاری رہتا ہے اور اس کیفیت میں محبوب کی تعریف کرنا، بار بار اس کا ذکر کرکے تسکینِ قلب حاصل کرنا، یا پھر متعدد دفعہ محبوب کا نام لینے سے ورد و وظیفے کی شکل اختیار کرلینا ایک فطری عمل ہے اور اس رجحان کی عکاسی سراجؔ کے اشعار میں کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ:-

نام تیرا مطلع فہرست ہے دیوان کا
ہے زبان کا وہ خاصا اور وظیفہ جان کا

لیکن سراجؔ یہیں نہیں رکا بلکہ محبوبِ حقیقی کے عشق میں غوطہ زن ہوکر خدا کی تعریف و توصیف اس طرح بیان کرتا ہے کہ:-

توں احد ہے نام تیرا احمد بے میم ہے
زیب پایا تجھ صفت سیں ہر ورق قرآن کا

مضامین

نقشِ قدم ہوا ہوں محبت کی راہ کا
کیا دلکشا مکاں ہے میری سجدہ گاہ کا

عشق میں محبوب کی خوبیوں سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ محبوب کی خوبصورتی کے آگے کوئی نہیں ٹکتا اور جب بات محبوبِ حقیقی کی خوبیوں کی ہو تو اس جگہ اس کا کوئی ثانی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے محبوبِ حقیقی کی خوبیوں کا ذکر سراجؔ نے یوں کیا ہے:

تو شہنشاہِ ملکِ خوبی ہے
خوبرو کیوں نہ دیویں تجھ کو خراج
خوبرویوں نے دیے تجھ کو خراج اے شاہِ حسن
ملکِ خوبی میں مگر نہیں ہے تیرا ثانی آج

خدائے وحدہٗ لاشریک کے بعد اگر کوئی ذات قابلِ احترام و اعتبار ہے تو وہ رسولؐ پاک کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ جس شخص کے دل میں رسولِؐ پاک کی محبّت نہ ہو تو خدا سے اسکا دعویٰ محبت جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اور رسولِؐ پاک کی محبّت' ان کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اللہ ربّ العزّت خود اپنے حبیب سے کہتا ہے جس کا ترجمہ ہے کہ ''اے نبی جی آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ آپ سے محبّت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے لئے آپ کی اطاعت شرط ہے''۔ لہٰذا رسولِؐ پاک سے بے پناہ محبّت اور انسیت کے جذبے سے سرشار سراجؔ کہتا ہے کہ:-

اپنا جمال مجھ کوں دکھا یا رسول آج
عاجز کی التماس کو کرنا قبول آج
یا محمد تجھ کرم سیں ہوں سدا امیدوار
جلوۂ ایماں دے اور بھید کہہ انساں کا
کر شرابِ شوق میں بے ہوش مجھ کوں یا حبیب
دے مجھے بھر کر پیالہ نشۂ عرفاں کا

سراجؔ معروف صوفی و بزرگ حضرتِ سید عبدالرحمٰن چشتی سے بیعت تھے اور چشتی سلسلے کے بزرگ نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ دراصل نظریۂ وحدت الوجود تصوّف کی ایک شاخ ہے اور اس نظریے کی وضاحت مختلف صوفیا و مشائخ نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ شیخ اکبر عرف ابنِ عربی اس نظریے کے بہترین شارح مانے جاتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب ''**فصوص الحکم**'' میں اس نظریئے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نظریۂ کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس میں خدا کا جلوہ ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ خدا کے جلوے سے ہی ہے یعنی ہر جگہ خدا ہی خدا ہے۔ لہٰذا چشتی سلسلے سے تعلّق ہونے کی وجہ سے سراجؔ کی شاعری پر نظریۂ وحدت الوجود کا اثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر قطرۂ اشک میں ہے ظاہر پیو کی صورت
پانی میں جیوں عیاں ہے مہتاب کا تماشا
نظر کو دیکھ ہر شئے نورِ الٰہی ہے
سراجؔ اب دیدۂ دل میں صمد دیکھا صنم بھولا
جو کوئی شغلِ کثرت سے خالی ہوا

مضامین

وہ اسرارِ وحدت کا حالی ہوا
جو دل کا آئینہ ہو صاف رنگِ غفلت سیں
عیاں ہے معنی ہر شئے میں صورتِ محبوب
صفحۂ دل پہ سینہ چاکوں کے
نقش ہے اس نگار کی صورت

خالص عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ شرکت کو برداشت نہیں کرتا۔ چاہے وہ عشقِ حقیقی ہو یہ مجازی عشق ہو۔ اور اللہ پاک تو شرکت کو قطعی برداشت نہیں کرتے۔ رسولِ پاکؐ نے ہمیں وحدانیت کا پیغام دیا اور تمام عمر اسی کی تعلیم و تربیت اور اس کی مشق کرانے میں سرگرداں رہے۔ قرآنِ کریم میں واضح ارشادِ خداوندی ہے۔ ''قل ھواللہ احد''۔ اور سچّائی یہ بھی ہے کہ جو کوئی اس ذاتِ واحد کی محبّت کا مزہ پالیتا ہے اس کے لئے دنیا کے عیش و آرام کی کوئی وقعت نہیں رہتی اور اس بیخودی میں وہ اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اسے جنت کی بھی تمنّا نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ عشق میں فائدہ اور نقصان کی پرواہ نہیں ہوتی اور سچّے عشق میں انعام و اکرام کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ آیئے دیکھیں سراج کی غزلوں میں ان خیالات کو کس طرح پرویا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مئے خانۂ وحدت کا جو کوئی جام پیا ہے
آرام کے کوچے سے نکل بے خبر آیا
اے سراجؔ اپنی خودی کو بیخودی میں محو کر
شغل جاری رکھ ہر ایک دم میں ہوالرحمٰن کا
میرے بغل میں خواہشِ دنیا کا بت نہیں
کچلا ہوں میں لات سے سر اس منات کا
مسکن ہوا ہے میرا جب سیں تیری گلی میں
اے گلعذار تب سے جنّت کی نہیں تمنّا

سراجؔ کی مشہور و معروف غزل جس کا مصرعۂ اولیٰ ''خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' ہے ادبِ اردو میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ اس غزل کو پڑھنے سے قاری پر ایک سرور سا چھانے لگتا ہے۔ گرچہ مذکورہ غزل صوفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے لیکن یہ سراجؔ کی فنکاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے کہ انہوں نے اس غزل میں بھی عاشقانہ رنگ کو بڑی خوبصورتی سے گھول دیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
کبھی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا مگر
ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیونہی دھری رہی

جیسا کہ اس سے پیشتر یہ کہا جا چکا ہے کہ سراجؔ کا ظاہر بھی پاک تھا اور باطن بھی۔ اس لئے بیشتر مقامات پر جہاں ان کی شاعری میں عشق کا ذکر ہوا ہے اس سے پاکیزہ عشق ہی مراد ہے یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عشق میں ہوس، لالچ، طمع اور شہوت وغیرہ جیسی لعنتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شاید اسی لئے سراجؔ یہ درس

مضامین

دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ:-

گرفتارِ ہوس کیا لذّتِ دیدار کوں پاوے
جدا جو کوئی ہوا ہے آپ سیں پایا وصال اس کا
بوالہوس کا کام نہیں ہے عشق کا دعویٰ سراجؔ
عشق کی لذّت اسے ہے جس نے عالم کوں تجا

سراجؔ کے نزدیک عشق محبوب کے لئے دنیا کو قربان کردینے کا نام ہے۔ اس میں کسی طرح کی منافقت کی کوئی جگہ نہیں اور نا ہی دکھلاوے کو دخل ہے جیسا کہ بعض نصیحت کرنے والوں میں دکھائی دیتا ہے۔ عشق دکھلاوے کی چیز نہیں ہے اور ایسے ہی ناصحین وشیوخ پر سراجؔ طنز کرتے نظر آتے ہیں کہ:-

تیرے سخن میں اے ناصح نہیں ہے کیفیت
زبانِ قلقلِ مینا سیں سن کلامِ شراب
اے قبلۂ دل وجاں تیری بھنوں کے دیکھے
زاہد کو خوش نہ آوے محراب کا تماشا
کیونکہ ہوئے زاہد خود بیں مریدِ زلف
اس نے ساری عمر میں زنّار کوں دیکھا نہ تھا

اس مختصر سے تجزیئے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سراجؔ کی غزلیہ شاعری میں عشقِ حقیقی کے تصوّر کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ اور ان کے کلّیات کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک صوفی شاعر تھے بلکہ وہ اس دنیا کو ایک حسن پرست کی نگاہ سے دیکھتے تھے، نیز ان کے نزدیک عشق ایک پاکیزہ جذبے کا نام ہے۔ کوئی بوالہوس عاشق نہیں ہوسکتا اور محبّت ایثار چاہتی ہے۔ عشق کا راہی راحت و آرام سے محروم ہو جاتا ہے اور تلاشِ یار میں بار بار محبوب کی گلی میں جانے کو ہی وہ اپنی حیات کا مقصد سمجھتا ہے اور جب وہ محبوب کی گلی کو اپنا مسکن بنا لیتا ہے تو گویا اس کے دل میں اب کسی چیز کی تمنّا باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے لئے جنّت وجہنّم سب بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ سراجؔ کی فکر میں گہرائی و گیرائی دونوں موجود ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سراجؔ کی شاعری میں عشق کو مرکزیت حاصل ہے اور اسی جذبے نے سراجؔ کو لا زوال انفرادیت بخشی۔

☆☆☆

ارشاد احمد

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی، پارک سرکس کیمپس، کولکاتا 188، ایم۔این۔کے روڈ (نارتھ)، پوسٹ المبزار، بارہ نگر پی ایس ضلع شمالی 24 پرگنہ، کولکاتا۔700035 (ویسٹ بنگال)

موبائل: 9007417411

oOo

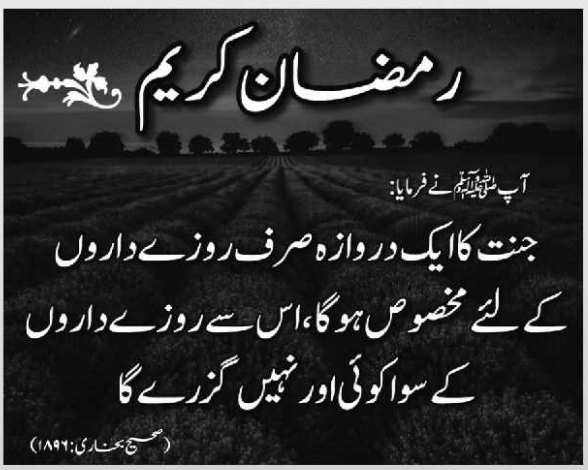

مضامین

اُردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' ایک مطالعہ

اُردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات '' آئینہ در آئینہ'' کے خالق حمایت علی شاعر ہیں۔ یہ کتاب سال 2001ء میں ''دنیائے ادب'' کے زیر اہتمام شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ 400 صفحات پر مشتمل اس طویل منظوم خودنوشت میں مصنف نے اپنی سوانح حیات کو نظم اور غزل کی ہئیت میں قلمبند کر کے اردو ادب میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اس لیے اپنی سرگزشت حیات، واقعات و روداد، حالات و کوائف، ماضی کی تلخ و شیریں یادوں اور اپنی شخصیت کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ حمایت علی شاعر اپنی کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے کتاب کے ''حرف اول'' میں لکھتے ہیں:

'' آئینہ در آئینہ'' ایک طرح سے میری منظوم خودنوشت سوانح حیات کا ''حرفِ آخر'' ہے جو میں نے اب سے پندرہ بیس سال پہلے ایک نظم کی صورت میں لکھ دیا تھا''

(آئینہ در آئینہ ص:8)

وہ لکھتے ہیں کہ صہبا لکھنوی نے ان سے مخاطب ہوکر ایک بار کہا ''تم جو مختلف نظموں میں اپنی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے رہتے ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ با ضابطہ اپنی سوانح حیات لکھ ڈالو''۔ اس طرح یہ حمایت علی شاعر نے کتاب صہبا لکھنوی کی باتوں سے تحریک پا کر منظوم انداز میں لکھنے کا فیصلہ کیا جو بقول نکہت بریلوی ''شعری ادب میں پہلا تجربہ ہوگا''۔ یہ واقعتاً پہلا اور کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ انھوں نے Voice of America کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اپنی کتاب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''آئینہ در آئینہ'' میری منظوم سوانح حیات ہے۔ اردو میں سوانح حیات نہیں لکھی گئی۔ چھوٹی موٹی کہانیاں ٹوسٹوری ٹائپ چیزیں تو لکھی گئیں، لیکن پوری زندگی قلم بند کرنا مشکل ہے جس میں زندگی کی مشکلات اور باقی تمام مسائل بھی ہیں، یہ پہلی بار میں نے لکھا اور میری ہمیشہ ایک آرزو رہی کہ کوئی ایسا کام کروں جو میرے نام سے منسوب رہے''۔ (بحوالہ اردو ادب کی قد آور شخصیت: حمایت علی شاعر، از: مدیحہ انور۔ ہفتہ روزہ ادبستان، پاکستان، 9 جولائی 2011

حمایت علی شاعر کو اردو شاعری میں صنف **ثُلاثی** کے مُوجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اردو میں تین مصرعوں والی صنف شاعری کو لکھنے کا تجربہ حمایت علی شاعر نے کیا ہے۔ جسے بعد میں **گلزار صاحب** نے اپنی کتاب ''**بات پشمینے کی**'' میں **ثُلاثی** کے بجائے ''**ترویٰنی**'' لکھی ہیں۔ حمایت علی شاعر کی ایک ثُلاثی ''یقین'' کے عنوان سے ملاحظہ کیجئے:

دشوار تو ضرور ہے، یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرارِ شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، بوجہل تو نہیں

حمایت علی شاعر کو شعر و سخن میں قدرت حاصل ہے۔

مضامین

اپنے اطراف واکناف میں درپیش مسائل، تاریخی واقعات کی صداقت، انسانی زندگی اور بدلتے ہوئے زمانے کے کرب، انسانی رشتوں میں بدلاؤ، قدیم و جدید زندگی کے تضاد و تقاضوں یعنی بیرونی و خارجی زندگی کے علاوہ خود مصنف کی ذاتی و داخلی زندگی کے تمام مسائل و وجوہات، حالات و کیفیات، نازک و معصوم جذبات ہوں یا اعتماد و حوصلہ کی بلندیاں، غرض گردش جہاں کو انھوں نے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر شاعری کا جامع پہنایا ہے، ڈرامائی نظم ہو یا افسانوی نظم یا تُلاتی انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا ہے پھر یہ طویل منظوم خودنوشت سوانح حیات وجود میں آئی۔ ''آئینہ در آئینہ'' اردو کی پہلا منظوم خودنوشت سوانح حیات ہے اس سے قبل بیانیہ منظوم یا داستانیں لکھی جاتی تھیں مگر منظوم خودنوشت سوانح حیات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ قدیم مثنویوں میں شاعر ابتدائی حصے میں اپنے حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں کچھ اشعار لکھا کرتے تھے۔ حمایت علی شاعر نے اس ضمن میں پہلا تجربہ کیا ہے۔ اس بات کا اعتراف خود شاعر موصوف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''نثر میں خودنوشت سوانح حیات بہت لکھی گئی ہیں مگر نظم میں یہ ''پہلا تجربہ'' ہے، میں اسے پہلا تجربہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس میں واقعات، تاریخی حوالوں کے ساتھ مرتب ہوئے ہیں۔ اس میں دکھ درد (ہمارے) مشترکہ دکھ درد ہیں اور میری خوشیاں، میری بھی ہیں ایک طرف آپ کی بھی۔ شاعری کا کمال یہی ہے کہ وہ فرد کی معرفت ''اجتماعی انسان'' کی ترجمان ہوتی ہے''۔ (ص:12 آئینہ در آئینہ)۔

کتاب کا انتساب ''پاکستان کی نئی نسل کے نام'' کرتے ہوئے ابتداء غالب کے اس شعر سے کی ہے:

بامن میاویزائے پدر، فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

اور اپنے اس شعر کے ساتھ تخلیقی کاروائی کو مزید آگے بڑھاتے ہیں:

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

یہاں سے قارئین اُس شاعر کی صلاحیت، لیاقت، ذوق وشوق، اسلوب وانداز بیان اور حُسنِ تحریر اور کمال فن کے قائل ہوجاتے ہیں اور مزید اس منظوم خودنوشت کے مطالعہ کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔

حمایت علی شاعر 14 جولائی 1926ء کو اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، 1940ء میں حیدرآباد دکن آئے اور آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوگئے۔ آپسی سازشوں کی بنیاد پر انھیں ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ کچھ برسوں تک تلاشِ معاش کے سلسلے میں بھٹکتے رہے، اس دوران کئی اخباروں میں ملازمت کی، ان میں 'پرواز' اور 'دکن آواز' اہم ہیں۔ حمایت علی شاعر نے جب ہوش سنبھالا تو فکرِ معاش نے گھیر لیا، مختلف مقامات پر قسمت آزماتے رہے لیکن کہیں کوئی مستقل ذریعہ نظر نہیں آیا۔ جب

مضامین

فکرمعاش اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبنے لگے تو قسمت آزمائی کے لیے بمبئی گئے وہاں ترقی پسندوں اور اشتراکیوں کی صحبت ملی۔اس دور میں حکومت اشتراکیوں کی آواز کو بند کرنے میں شد و مد سے لگی ہوئی تھی۔ان حالات کے چلتے وہ بھی بمبئی چھوڑ کر لوٹ گئے۔حیدرآباد دکن میں پہلے ہی سے ان کے قدم نہ جمنے دئے جارہے تھے۔1951ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔شاعری کا شوق فطرت میں شامل تھا اور پاکستان میں اس ذوقِ سلیم کو اور جلا ملی۔بہت جلد میدان ادب میں اپنا مقام بناپالیااور پہلاشعری مجموعہ ''آگ میں پھول''منظر عام پر آیا جس کو1956 میں presidential award سے نوازا گیا،پھر یکے بعد دیگرے کئی اور کتابیں شائع ہوکر منظرعام پر آئیں۔جیسے''مٹی کا قرض''،''تشنگی کا سفر''،''ہارون کی آواز''علامہ اقبال ایوارڈ یافتہ،''حرف حرف روشنی''وغیرہ۔2007 میں ان کی کلیات بھی شائع ہوئی۔پاک ٹی وی میں ملازمت کے دوران ایک پروجیکٹ پر کام کرکے سات سوسال کی ادبی ذخیروں کو یکجا کیا جس میں نظم،نعتیہ کلام اور شاعری شامل ہے۔سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔1976ء سے 1986ء تک سندھ یونیورسٹی میں بطور ایسوسیٹ پروفیسر کام کرتے رہے،ملازمت سے سبکدوشی کے بعد شاعری اور تخلیقی کام کو جاری رکھتے ہوئے پاکستان اور کینیڈا میں اپنے بچوں کے پاس مقیم رہے۔انھوں نے فلمیں بنائیں،فلمی گیت لکھے، صحافت سے منسلک رہے،درس و تدریس کے شعبے میں خدمات انجام دیں اور زندگی بسر کرنے کے مختلف انداز اختیار کیے۔Pride of Performance(پرائیڈ آف پرمارمنس) اور نگار ایوارڈ جیسے ممتاز ایوارڈز سے نوازے گئے۔یہ بات اداس کرتی ہے کہ ان کی زندگی میں ترک وطن کا ایک تسلسل رہا۔وہ اورنگ آباد اور حیدرآباد دکن سے نکلے تھے اور پھر آدھی زندگی حیدرآباد سندھ میں گزار کر پاکستان سے کنیڈا کا رخ کیا۔شہر در شہر بھٹکتے رہنے والا یہ مسافر اپنی آخری عمر میں ایک طویل علالت کے بعد16 جولائی2019ء کو ٹورنٹو میں ابدی نیند سوگیا۔اردو کے مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین ان کے عزیز دوست ہیں اور ناول نگار نورالحسنین ان کے چچازاد بھائی ہیں۔

حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے،پاکستان میں بھی اس تحریک سے ان کی وابستگی رہی۔اردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات اپنی یادگار چھوڑ کر انھوں نے اردو ادب کے باب میں ایک نیا اضافہ کیا ہے۔نصیراحمد ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

Although shair is genenrally identified with his commercial poetry written for feature films,his literary achivements were immense He has to credit seven collections of poetry,including "Aag mein

phool","mitti ka qarz","tanhai ka safar","Haroon ki awaz" and "Harf Harf Roshni". His four prose books include a collection of his radio and stage plays, Besides ,he is the only poet in urdu who has written his autobiography tittled "Aaina Dar Aaina "in verse comprising as many as 3500 couplets spread over 400 pages"

Dawn ..features 29 may 2008)

اس خودنوشت کی ابتداء ایک نظم 'آئینہ در آئینہ'' سے ہوئی ،جس میں مصنف نے پوری زندگی اور فلسفہ حیات کا نچوڑ اور شعور و مشاہدے کو بیان کیا ہے۔وہ اپنے عکس سے ہم کلام ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔انسانی زندگی اور گردش کائنات دریا کی طرح رواں رہتی ہیں۔اس کا ماضی سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ انسان اس تیز رفتار زندگی میں مسلسل جدوجہد کرتے ہوئے منزل مقصود کی تلاش میں گامزن ہوتا ہے اور آخر منزل وہی ہوتی ہے جہاں سے انسان آتا ہے،مگر اندر کا انسان ہمیشہ رواں رہتا ہے ،عکس دائم رہتا ہے اور یادوں اور خوابوں کا بسیرا رہتا ہے ۔یہ نظم William Shakespeare کی نظم All the World is a stage کی یاد دلاتی ہے۔

حمایت علی شاعر کا تعلق ہندوستان کے ایک تاریخی اور اساطیری شہر اورنگ آباد سے تھا۔ابتدائی زندگی یہاں گزاری ۔اس شہر کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے جانا گیا ہے ۔یہاں کے تاریخی مقامات ،اجنتا ایلورا ،بی بی کا مقبرہ ، اورنگ زیب کا مقبرہ خصوصاً یہاں کی تہذیب ،دیومالائی تمثیلی واقعات اور فن سنگ تراشی وغیرہ مشہور ہیں ۔خودنوشت نگار نے بہت خوبصورتی سے تاریخی واقعات و مقامات کی تصویر کشی کی ہے ،جس سے ان کی منظر نگاری ،تاریخ پر عمیق نگاہ ،کمال مصوری کا اندازہ ہوجاتا ہے ۔پھر اپنے آباواجداد ،خاندانی پس منظر اور گھریلو ماحول کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں :

میں جس گھرانے کا ہوں فرد مذہبی تھا بہت
طریقتی بھی تھا لیکن شریعتی بھی تھا بہت
فقیہہ و قاضی و صوفی مرے آب و جد تھے
بڑے نمازی' تہجد گزار' سیّد تھے

مزید لکھتے ہیں:

وہ گاؤں جو مرے اجداد کا گلستاں تھا
وہ گلستاں تھا کہاں اب تو ''دشتِ کنعاں'' تھا
جہاں کہیں مرے دادا کی قبر ہے اس کو
میں ''چاہ یوسفِ کنعاں'' کہوں تو بہتر ہو

(ص:25)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے خاندان کے بزرگ فقیہہ' دین دار ،صوفی منش' زاہد و پرہیزگار ،مال ومتاع سے بے نیاز ،قناعت پسند اور خداپرست لوگ تھے ۔بقول شاعر ان کے بزرگوں نے نوابوں کی زمین کی عنایت کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ان کے دادا کے انتقال کے

بعد بیوہ دادی کو لوگ ستانے لگے تو ان کے والد تراب علی نے نظام فوج میں نوکری کر لی۔ انھوں نے اپنے والدین کی شادی کو ایک خوبصورت نظم میں بیان کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

بہو بنا کے اسے لائیں اپنے گھر کے لئے
چراغ گھر میں جلائے گئے سحر کے لئے
شب برات تھی اس رات اور دوالی بھی
بہت ہی نیک قدم تھی، گھر آنے والی بھی

1951ء میں ہجرت کر کے پاکستان گئے اور حیدرآباد سندھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی یہ بات قابلِ غور ہے کہ آزادی کے چار سال بعد وہ پاکستان گئے لیکن وہاں کی صورتِ حال خصوصاً مہاجروں اور پناہ گزیروں کی بدحالی اور کسمپری وہی تھی جس کا تذکرہ 1947ء میں ہجرت کرنے والوں نے لکھا ہے۔ انھوں نے ایک نظم ''مہاجر بستیاں'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل، مجہول، نگہ گور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم

(ص:163)

اس منظوم خودنوشت میں مصنف نے اپنی نجی زندگی، داخلی کیفیات، گھریلو مسائل، ذاتی مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے تاریخی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، تہذیبی اور عوامی زندگی کے تمام پہلوؤں پر قلم آرائی کی ہے۔ اس کتاب کو ایک اہم تاریخی دستاویز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مصنف ایک ایسے دور کی پیداوار ہیں جہاں سامراجی و زمینداری اور شاہی و نوابی دورِ حکومت زوال پذیر تھا۔ ایک طرف شاطرانہ انگریز اور چند موقع پرست سیاستدانوں کے شطرنجی کھیل کے سبب ہندوستان جیسے مشترکہ تہذیب و تمدن والے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ اس سرزمین کو چیر کر LOC کے نام پر ایک سرحدی لکیر کھینچی گئی۔ جس کے نتیجے میں انسانی رشتے، جذبات، تہذیب و تمدن اور قدریں بکھر کے رہ گئیں اور اس کی جگہ منافرت اور خون ریزی کی ایک بدبودار فضا پیدا ہوگئی۔ خدائے وقت حاکموں کی چالاکی، موقع پرستی اور ظلم نے عوام کو استحصالی اور سماج کو بحرانی دور میں پہنچا دیا۔ اس دردناک داستان کی جھلک ''آئینہ در آئینہ'' میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ''پاکستان'' جو جناح کا دیرینہ خواب تھا اس کی تکمیل ہوگئی مگر کچھ صاحبِ اقتدار اور چالاک حاکموں نے اسے اپنے مفاد کے لیے عوام پر مختلف قسم کے ظلم و جبر کرنا شروع کیا۔ جس کے بارے میں اس خودنوشت میں متعدد مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پاکستان کی اندرونی سیاست، سیاستدانوں کی آپسی رنجشیں، اقتدار کے لیے لڑائیاں، مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کی تاریخی و سیاسی واقعات و حالات کو انھوں نے اپنی شاعری میں سمیٹ کر اس دور کی تمام حالات کو حقیقی داستان کی طور پر قارئین کے سامنے پیش

مضامین

کیا ہے۔ پاکستان میں مختلف سیاسی پارٹیوں کی آپسی دشمنی ، آپسی نااتفاقیوں،اقتدار کے لیے لڑائی ،دولت و طاقت سے کرسیاں خریدنے کی کوششیں ، مسلم نمائندگی کے حامی تو کہیں Army Dictatorship کی حق میں لڑنے والے لوگ میدان میں کودنے لگے ،اقتدار کی ہوس میں حریف سیاستدانوں کا صفایا کیا جانے لگا بلکہ مسئلہ کشمیر، جمہوریت ،اسلامی نمائندگی ،مارشل لاء اور بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی اور پاکستان کی شکست کی داستان بیان کی ہے ۔عوامی لیگ نے ہندوستان سے مدد طلب کرکے مشرقی پاکستان کو''بنگلہ دیش'' بنادیا۔اس تاریخی واقعہ کوانھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

عوامی لیگ''نے بھارت سے رشتہ جوڑ لیا
اور اپنا ''ملکی تعلق'' بھی ہم سے توڑ لیا
بنائی ہند میں اپنی ''جلاوطن سرکار''
اور ایک ''دیس'' بنانے کی راہ کی ہموار
پھر انڈیا سے طلب کرکے فوج کی امداد
اسی زمین پر رکھی ''بنگلہ دیش'' کی بنیاد
جواس کے بعد ہوا ہے'وہ سب ہی جانتے ہیں
وہاں جوخون بہا ہے'وہ سب ہی جانتے ہیں

(ص:226)

تقسیم ملک کی وجہ سے خودنوشت نگار پر کیا بیتی اُس دور کے درد وکرب ،تکالیف،مجبوریوں ،افلاس وغربت کی کہانی نہ صرف حمایت علی شاعر کی کہانی لگتی ہے بلکہ پوری قوم کی اجتماعی زندگی کی داستان لگتی ہے۔انھوں نے تمام واقعات کوصداقت کے ساتھ خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ یہاں یہ سوانح حیات آپ بیتی سے جگ بیتی بن جاتی ہے ،جو خودنوشت کی کامیابی کا ثبوت ہے۔بقول پروفیسر ممتاز حسین ''حمایت کی شاعری اگرایک طرف اپنی خودنوشت سوانح عمری ہےتو دوسری طرف قومی تاریخ کا آئینہ''۔

شاعری چاہے نظم ہو یا غزل اسے لکھنے کے اپنے اپنے پیمانے ہوتے ہیں۔فنی پیکروں میں شاعر اپنے کلام کے ڈھالتے ہیں اورصنفِ شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ شاعر کا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دل کی بات اور دلی کیفیات اور خیالات کے اظہار کے لیے شاعری کو وسیلہ بناتا ہے۔شاعری میں سائنٹفک اسلوب میں یعنی کم الفاظ میں زیادہ بات ادا ہوتی ہے ۔علم بیان ہو یا علم عروض ،اس میں الفاظ کو پرونے کے scale ہوتے ہیں جس میں اپنے اشعار کو ڈھالنا شاعر کا کمال ہے۔حمایت علی شاعر جب کسی تلخ حقیقت کو جو سیاسی اعتبار سے خوشگوار نہیں ہے پیش کرتے ہیں تو اسے تلمیحات، استعارات اور کنائیوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ بند ملاحظہ فرمائیں:

غبارہ جتنا بھی اونچا اڑے'غبارہ ہے
ہوا کی زد میں ہے(وہ چاند ہے نہ تارا ہے)
الیکشن آئے تو نقشہ بدل گیا سارا
تلوں میں تیل تھا جتنا نکل گیا سارا

(ص:258)

اول الذکر نظم میں انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے نظریات ، پالیسیوں اور اصولوں پر طنزیہ

مضامین

انداز میں ،علامت کے طور پر استعاروں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔بھٹو کی سوشیلسٹ ہو یا شیخ کی جمہوریت پسند، یا آرمی کی فیوڈل نظامِ حکومت ،اس کتاب میں تمام سیاسی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔

اس خودنوشت میں ہندوپاک کے ادبی حلقوں، شاعروں ،ادیبوں ،ادبی جماعتوں اور تنظیموں پر کئی نظمیں لکھی گئیں جس سے اس دور کے شاعروں ، ادیبوں ، ادب کے قدردانوں وادبی منظرناموں اور ادبی وسماجی رجحان کا اندازہ ہوجاتا ہے۔حمایت علی شاعر ایک ادب نواز اور ادب دوست شخصیت کے مالک ہیں ،انھوں نے اپنی زندگی ادب وتخلیق کے لیے وقف کی اور اسے ذریعہ معاش بھی بنایا۔پاک و ہند کے مختلف ادبی حلقوں اور ادبی نشستوں میں بلاناغہ شریک رہتے۔انھیں ایک مشاعرے کے غرض سے حیدرآباد دکن آنا ہوا بقول شاعر زندگی میں سب سے یادگار سفر تھا۔ادبی محافل میں ان کی شرکت محفل کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔ وقت کے ادیب و شاعر ان کا نہایت خلوص سے استقبال کرتے تھے ،ادبی دورے کے سلسلے میں انھیں مختلف ممالک میں جانے کے مواقع ملے۔مختلف سیمیناروں ، کانفرسوں اور مشاعروں میں ہمیشہ مدعو رہتے تھے جہاں ان کی ملاقات اپنے وقت کے عظیم ادیبوں، دانشوروں اور اسکالروں سے ہوتی تھی' ان اسفار کے بارے میں ،دوستوں وعزیزوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ایک واقعہ کے بارے میں نظم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں ایک انڈو افریقن خاتون سے محبت ہوئی ،ابھی آغازِ محبت تھا کہ ہوش جاگ گئے:

عجیب بات ہے' تم دور دور رہ کر بھی
نگاہ و دل میں کوئی فاصلہ نہیں رکھتے
مثالِ آئینہ و عکس روبرو ہیں سدا
گواہ بھی کوئی اپنے سوا نہیں رکھتے

مزید لکھتے ہیں:

یہ دل کی بات ہے، دل میں رہے تو اچھا ہے
نظر کی بات ، نظر ہی کہے تو اچھا ہے

مصنف نے اپنی نجی زندگی ،گھریلو مسائل ،ذاتی و دلی کیفیات، شاد وغمی کے جذبات، مجبوریوں ومحرومیوں، ضروریات ،معاشی تنگدستی و بدحالی غرض ہر ایک پہلو کے بارے میں متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ان کی مسلسل جدوجہد، محنت اور قربانیوں کا صلہ ہے کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر عملی زندگی میں اچھے مقام پر پہنچی۔جب وہ ہجرت کر کے گئے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔مال جائیداد اور گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تن تنہا ایک نوزائیدہ ملک میں روشن اور آسودہ مستقبل کے خواب لے کر گئے تھے۔اس وقت ان کے پاس علم کی دولت اور شاعری کے فن ،یہ دو قیمتی اثاثے ہی تھے اور یہ محض ان کا کل سرمایہ تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن چونکہ حمایت علی شاعر ایک رجائیت پسند شخصیت کے مالک تھے اس لیے انھیں ہجرت اور مختلف مقامات میں رہنے اور مختلف پیشے اختیار کرنے میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی منظوم

مضامین

خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' حمایت علی شاعر کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا پہلا تجربہ ہے۔ جو ایک کامیاب کوشش کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ مختلف ادیبوں و نقادوں نے اس تجربے کو کامیاب قرار دیا ہے۔ ماضی کی تلخ و شریں یادوں، روداد، واقعات اور داستانِ حیات کو بیان کرتے وقت کہیں کہیں واقعات کو تسلسل اور صحت مند طریقے کے ساتھ بیان کرنے میں چوک گئے ہیں لیکن ادبی تقاضوں کو کبھی کمزور پڑنے نہیں دیا۔ زیرِ نظر خودنوشت میں نظم و غزل دونوں کا لطف آتا ہے۔ موقعہ محل کی مناسبت سے صنائع بدائع کا بہترین استعمال کیا گیا ہے۔ شاعری سلیس و عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔ شائستگی و شگفتگی، ندرت بیان، شیریں کلام اور فصاحت و بلاغت غالب ہے۔ جس سے قارئین کے مطالعہ میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کہیں کوئی بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ اس خودنوشت میں نصف صدی سے زائد عرصے کی پوری تاریخ ملتی ہے۔ خودنوشت کو منظوم ہئیت میں لکھنا دشوار کام ہے مگر حمایت علی شاعر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی، تبھی یہ تجربہ اردو ادب میں پہلی مرتبہ ہوا اور وہ بھی ہر پہلو سے کامیاب۔

☆☆☆

سارہ بتول

ریسرچ اسکالر، پی ایچ۔ڈی (اردو)

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)

MOB: 9490029362

حضرت داغؔ دہلوی کی ایک غزل

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا

کیا آئے راحت آئی جو کنجِ مزار میں
وہ ولولہ وہ شوق وہ ارمان تو گیا

دیکھا ہے بت کدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا
گو رشک سے جلا ترے قربان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

oOo

مضامین

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی، ''دیکھ لینا گاما چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔''

جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا، ''ولایت میں اور کہاں؟''

اسپین کی جنگ چھڑی۔ اور جب ہر شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا، ''یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتی رہتی ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا۔ اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، 'جا، تیرے ہندستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے' اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی، ''یہ کانگرسی ہندستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔''

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے

افسانہ

بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ وسپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی۔ اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مار کہ سگرٹ پیتے یا حُقّے کے کش لگاتے ہوئے اس 'گورے' کو جی بھر کر سنایا کرتا۔ ''۔۔۔'' یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا، ''آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔''

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا، ''شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔۔۔ بالکل مردار، ایک دھپّے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔۔۔'' یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا۔ اور ناک کو خاکی قمیص سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا،

''قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔''

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے، ''سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔۔۔ یا ہر چیز بدل جائے گی؟''

''ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟''

''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟''

''یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔'' ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے

افسانہ

کہتا، ''چل بیٹا۔۔۔ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔''

ماروا ڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا، ''ہت تیری ایسی تیسی۔''

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب وغریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔۔۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ماروا ڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسّرت کی ایک لہر دوڑ ا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ماروا ڑیوں کو گالی دی۔۔۔ ''غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔۔۔ نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔''

وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا، ''لا ہاتھ ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔'' اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا، ''تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔''

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں، اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ ''کوانڈیا ایکٹ'' یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انھیں ''روس والے بادشاہ'' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں 'روس والے بادشاہ' اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر

افسانہ

بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا،''جدید آئین کا دوسرا حصّہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!''

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے کہا،''یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔'' چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا،''ٹوڈی بچے!'' جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور''ٹوڈی بچے'' کی تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا،''نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔''

''ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' ''وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں' ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔''

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ وہ اس کو ایسی 'چیز' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔'نیا قانون۔۔۔!' وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی 'نئی چیز!' اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نِکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی 'نئے قانون' کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔ آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم

افسانہ

خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔۔۔وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔ اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں یکم مارچ کو چودھری خدابخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

''ابھی بہت سویرا ہے' دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔'' اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا، ''ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟''

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے' خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے مَیلے مَیلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔ تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں۔ اور اب لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری سے گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اس نے کئی بار اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا، ''تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے

افسانہ

رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچّہ جن دے گی؟ استاد منگو طبعًا بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا خواہش مند تھا بلکہ متجسّس تھا۔اس کی بیوی گنگا دیوی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی، ''ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور پیاس سے نڈھال ہو رہے ہو۔''

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بیقرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک، وہ بڑا آدمی تھا۔اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں۔تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں خیال کیا ''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔''

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔اور پچھلی نشست کے گدّے پر بیٹھ گیا۔۔۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔ گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔وہ اس قابل غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا۔جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بیحد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی

افسانہ

شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دئے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا، ''صاحب بہادر کہاں جانا مانگٹا ہے؟'' صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس ''گورے'' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب ''گورے'' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگرٹ سُلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں۔ اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے 'گورے' کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے۔ اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا، ''جانا مانگٹا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے۔'' اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی، اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا، ''کہاں

افسانہ

جانا مانگتا ہے؟'' استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا۔ ''ہیرا منڈی۔''

''کرایہ پانچ روپے ہوگا''۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلّایا۔

''پانچ روپے۔ کیا تم۔۔۔؟''

''ہاں، ہاں، پانچ روپے۔'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔

''کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟'' استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا، ''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔ وہی اکڑفوں۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچہ!''

لوگ جمع ہو گئے۔ اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔''

''وہ دن گزر گئے۔ جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔ نیا قانون!''

اور بیچارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ''نیا قانون نیا قانون'' چلّاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

''نیا قانون، نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!''۔۔۔ اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

☆☆☆

افسانہ

قصہ ماڈرن چہار درویش

اور جب رسمی علیک سلیک کے بعد چاروں درویش اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اورانہوں نے شروعات یہ کی کہ اس سے پچھلی ان کی ملاقات ایک سوسال پہلے ہوئی تھی۔اس وقت سے اب تک دنیا کتنی بدل گئی۔ جب وہ پچھلی ملاقات پر دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کر کے واپس آ کر اپنے اپنے سفری تجربات ایک دوسرے سے بانٹے تھے تو وہ کتنے خوش تھے۔انہیں دنیا کتنی حسین لگی تھی اوراسی خوشی میں آپس رائے سے انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ ہم چاروں سوسال کے بعد دوبارہ ایک جگہ جمع ہوکر اپنے اپنے سفرنامے کے واقعات ایک دوسرے سے Share کریں گے۔لیکن اس دفعہ کے سوسالہ سفرنامے کے بعدان سب کے دل بہت اداس تھے' وہ دنیا کے بگڑے ہوئے حالات سے بہت ملول تھے اوروہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ گذشتہ سوسال میں دنیا اتنی بدل جائے گی جوارتقائے دنیا سے اب تک تبدیل نہیں ہوا تھا وہ سب کچھ اتھل پتھل ان سوسالوں میں ہوگیا۔ پہلا درویش جومغربی ممالک کے سفر سے واپس آیا تھا وہ سب سے زیادہ اُداس اور بیزار تھا' اس نے اپنا قصہ شروع کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔اس ملاقات کے بعد ہم کسی ملک کے سفر پہ جائیں گے اورنا ہی وہاں کے حالات ایک دوسرے سے بیان کر کے دل گرفتہ ہوں گے۔اس کے بعداس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا' اس سے پہلی ملاقات پراس کے پاس قلم بند واقعات ہوتے تھے اس کے بجائے اب کی بار اس نے اپنے سیل فون میں فلم بند تجربات کو ترتیب دیا اور کھکھار کر گلا صاف کر کے اپنی سرگزشت یوں شروع کی۔

قصہ پہلا درویش

اور پھر جب میں تم لوگوں سے گذشتہ مرتبہ جدا ہوا تو میرے دل میں بس یہ سمایا کہ اب کی بار مغربی ممالک کی سیر کیوں نہ کی جائے جس کے بارے میں سنا تھا کہ یہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا' میں بہت خوش تھا کہ میں دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کی سیر کو جارہا ہوں' اس کا پہلا تجربہ مجھے یہ ہوا کہ جس جگہ جانے کے لئے میں سالوں کشتی کے سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا وہاں میں ہوا سے زیادہ تیز رفتار ترقی یافتہ جہاز سے پلک جھپکتے میں پہنچ گیا۔ ایرپورٹ پر اترنے تک مجھے بہت سارے لوگ نظر آئے لیکن ایرپورٹ سے باہر نکلنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ میں بالکل یکا وتنہا ہوں۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم نظر آیا۔ مجھے میری کم مائیگی کا اس وقت احساس ہوا جب کوئی میری طرف توجہ ہی نہیں دیا۔پھر یہاں سے میرے برے تجربے شروع ہوگئے۔ یہاں میں نے کسی انسان کو کسی انسان سے بلاضرورت ومطلب وغرض بات کرتے نہیں دیکھا۔ یہ لوگ صرف کتے، بلی اور دوسرے جانوروں سے بلاضرورت بات کرتے ہیں۔غیر انسان سے بات کرنا ان کی شان کے خلاف

طنز و مزاح

ہے۔کسی سے بھی بات کرنے سے پہلے وہ اپنی چمڑی کا رنگ سامنے والے کی چمڑی کے رنگ سے ملا کر دیکھتے ہیں اگر دونوں رنگ میاچ ہوگئے تو بات کرتے ہیں، مدد کرتے ہیں، گلے پڑ جاتے ہیں اور اتنا بکوا کرتے ہیں کہ سامنے والے کے کان پک جائیں اور اگر رنگ میں ذرا برابر بھی فرق آیا تو وہ آپ پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ ڈال کر آگے نکل جاتے ہیں' مگر ہر ایک کو دیکھ کر مسکراتے ضرور ہیں چاہے دل میں کتنا بھی زہر کیوں نہ بھرا ہوٗ ان پر قدرت کی اتنی لعنت پڑی ہوئی ہے کہ یہ برف باری میں بھی کپڑوں کی کمی کی وجہہ سے عورت اور مرد بہت ہی چھوٹے چھوٹے لباس پہن کر گھومتے رہتے ہیں۔ان کی نظر میں صرف اُن کا خون اور نسل اصلی ہے اور باقی سب غلام۔ان کو اس بات کا غرور ہے کہ وہ جس ملک کو یا جس نسل کو چاہیں منٹوں میں تباہ و تاراج کر سکتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا کر اپنی غلامی میں رکھ سکتے ہیں۔ان کی کسی بھی بات کو کوئی شاہ ہو یا گدا ملک ہو یا قوم نا نہیں بول سکتی' یہ قوم کیونکہ کسی کا حکم برداشت نہیں کر سکتی اس لئے یا تو ماں باپ بچوں کو گھر سے نکال دیتے ہیں یا بچے ماں باپ کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔محبت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے پاس رشتوں کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔شادی کے اٹوٹ بندھن کے معنی بدل کر وقتی رفاقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہاں عورت اور مرد ساتھ رہنے کے لئے شادی ضروری نہیں سمجھتے۔معاملہ یہاں تک بھی رہتا تو ٹھیک تھا لیکن اب یہ قوم ہم جنس پرستی کے زہر میں ڈوب گئی ہے۔اب مرد کو مرد اور عورت کو عورت اچھے دکھنے لگ رہے ہیں اور وہ ویسے ہی ساتھ رہ رہے ہیں۔رشتوں کی عظمت ختم ہوگئی ہے۔جس طرح بھیڑ، بکری، کتے، بلی میں رشتوں کا احترام نہیں ہوتا یہ اس سے بھی بدتر ہوگئے ہیں۔یہ لوگ دنیا پر حکومت کرتے ہیں لیکن اپنے خاندان پر حکومت نہیں کر سکتے۔ان کا سارا سماجی ڈھانچہ منہدم ہو چکا ہے۔کمیونٹی لائف کے ختم ہو جانے کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے اپنا سکھ دکھ نہیں بانٹ سکتے' جس کا نتیجہ یہ ہوگیا ہے کہ ہر مغربی شخص مختلف امراض میں مبتلا ہوگیا ہے جیسے Depression اور Anxiety عام بیماری ہوگئی ہے۔سو سال کا بوڑھا اپنا اقتدار اپنے بچوں کو دینا نہیں چاہتا اور چار سال کی عمر سے ہی بچہ اقتدار کھینچنے لگتا ہے۔یہاں بچوں کو کلیجہ سے لگا کر نہیں بلکہ دوسرے کمرے میں علیٰحدہ سلا کر پالتے ہیں۔یہاں پر ماں کا دودھ پلانے سے ماں کی خوبصورتی میں فرق آنے کے ڈر سے ڈبے کا دودھ پلا کر پالتے ہیں۔یہاں کے بچوں کے لئے سنڈے فادر اور سنڈے مدر ہوتے ہیں یا پھر ایک بچہ اپنے دوسرے دوست بچے سے بولتا ہے کہ یہ سال جو تمہارے فادر ہیں وہ چار سال پہلے میرے فادر تھے' اتنا کہہ کر پہلے درویش کی آواز بھرا گئی اور وہ ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

قصہ دوسرے درویش کا

جب پہلا درویش خاموش ہوگیا تو دوسرے درویش نے اپنی سرگزشت یوں شروع کی۔میں مشرق وسطیٰ کی طرف نکل گیا تھا' وہاں جا کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے ساری

دنیا تھم گئی ہو میں جس کو مشروق سمجھ کر گیا تھا وہ تو مغرب سے بھی بہت آگے تھی ۔ وہ خود کچھ نہیں کرتے لیکن ان کے پاس تیل کی اتنی دولت ہوگئی ہے کہ وہ دنیا کا ہر آسائش خرید سکتے ہیں ۔ دولت کی اتنی فراوانی ہے کہ وہ دنیا کی ہر جگہ سے انسان خرید کر ان کو غلاموں کی طرح استعمال کرتے جو وہاں کے ہیں وہ اصلی ہیں اور ان کی نظر میں باقی سارے لوگ نقلی ہیں ۔ جنہیں وہ جب چاہے اور جس طریقے سے چاہے استعمال کر سکتے ہیں ۔ ساری دنیا کے لوگوں کو یہ اپنی دولت کے بل بوتے پر غلام بنا کر رکھتے ہیں، لیکن یہ خود غلام ہیں سفید چمڑی کے ۔ ان کی نظریں صرف اور صرف مغرب پر مرکوز ہیں وہ مغرب کے بے دام غلام ہیں آج ترقی کے نام پر جو جو برائیاں مغرب میں موجود ہیں اس کا زہر رفتہ رفتہ مشرق میں بھی پھیل رہا ہے ۔ آزادی کے نام پر یہاں پر بھی بے حیائی فروغ پا رہی ہے ۔ اجالے میں کئے گئے گناہ کو یہاں گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کیا جانے والا گناہ گناہ نہیں مغرب کی تقلید کو یہ اپنی شان سمجھ رہے ہیں ۔ آزادی نسواں کے نام پر مغرب کی تقلید میں ہر قانون میں چھوٹ دی جا رہی ہے ۔ مقامی لوگوں کے علاوہ باہر کے لوگوں کی شخصی آزادی بالکل نہیں ہے ۔ حالانکہ ایک مذہب کے پیروکار ہیں لیکن اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ یہاں کے لوگوں کا ظاہر اور باطن الگ ہے ۔ یہ اپنے مذہب کے سچے پیرو ہیں لیکن انسانیت کے نہیں ۔ دوسری جگہ رہنے والے ہم مذہبوں سے نہ تو ان کو کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی وہ ان کی تکلیفوں پر کبھی کوئی آواز اٹھاتے ہیں ۔ ان کا ایک ہی فلسفہ ہے کہ ہم کو کچھ نہیں ہوا تو بس ہے باقی دنیا گئی بھاڑ میں ۔ ان کی خود غرضی، نفس پرستی اور پر تعیش زندگی کو دیکھ کر انسانیت پر سے میرا ایمان ختم ہوگیا اور سوچ لیا ہوں کہ پھر کبھی اس عالم غیر کا سفر نہ کروں گا یہ کہہ کر دوسرے درویش نے بھی ایک ٹھنڈی لمبی سانس بھری اور پیچھے ہٹ کر دیوار کو ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

قصہ داستان تیسرے درویش کی

دوسرے درویش کے خاموش ہونے کے بعد تیسرا درویش کچھ دیر اپنی آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا اور پھر یوں اپنی داستان شروع کی ۔ پتہ نہیں مجھے کیا جنون سوار ہوا تھا یا میری مت ماری گئی تھی جو میں نے پیلی زمین کو اچھی جگہ سمجھ کر وہاں کا رخ کیا میں جب اس ملک میں داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کباب کو چیونٹیاں لگ گئی ہیں ۔ ہر جگہ لوگوں کا اژدہام، سانس بھی لینے کو جگہ نہیں ۔ ہر طرف صرف آدمی ہی آدمی اور وہ بھی ایسے کہ مجھ جیسا آدمی ان میں کوئی فرق ہی نہیں محسوس کر سکتا تقریباً سب ایک ہی صورت ایک ہی قد و قامت اور لباس ، اصولاً تو وہاں کے آدمیوں کی شناخت کے لئے نمبر ڈال دیتے تو شاید آسانی ہوتی ورنہ ہمیں جس سے ملنا ہے اس کو کبھی پہچان کر نہیں مل سکتے تاوقتیکہ وہ خود ہمیں پہچان کر نہ ملے ۔ یہاں آدمیوں کی اتنی بہتات ہے کہ دوسرے تمام عام جاندار یہاں سے ختم ہوگئے ہیں اور یہ شاید واحد ملک ہے جہاں کے سارے حشرات الارض کو یہ لوگ کھا چکے ہیں ۔ اسی لئے وہاں سوائے انسان کے دوسرا کوئی جاندار نظر نہیں آتا ۔ آبادی کی

طنز و مزاح

زیادتی اورغذا کی قلت کی وجہ سے وہ جوملا وہ کھالیتے ۔ساری دنیا میں لوگ سانپ بچھواور دوسرے موذی جانوروں سے ڈرتے ہیں لیکن یہاں سانپ بچھووغیرہ آدمی سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ انہیں فوری پکڑ کر کھالیتے ہیں یہ لوگ صرف اپنے ملک کے لئے جیتے اوراپنے ملک کے لئے مرتے ۔ان میں انسانیت اوررحم کا جذبہ نام کونہیں ہوتا۔ یہاں کا ہرانسان یہ چاہتا ہے کہ وہ ساری دنیا پر قبضہ کرلے ۔ یہاں انسان نہیں صرف مشین ہوتے ہیں ۔ان کے کوئی جذبات اوراحساسات نہیں ہوتے یہ لوگ صرف کام کرتے رہتے ہیں کبھی تھکتے نہیں ۔اپنے ملک کے اتنے وفادار رہتے ہیں کہ اگر جوتے کی فیکٹری کے ملازم ہڑتال بھی کریں تو کام نہیں روکتے ۔ اگرایک ہزارجوڑی جوتا روز بنتا تھا تو دو ہزارایک پیر کے جوتے بناتے ہیں اور جب ہڑتال ختم ہوجاتی ہے تو دوسرے پیر کے جوتے بنانا شروع کرتے ہیں تاکہ پہلے مالک اسے بیچ نہ سکے اور جب ہڑتال ختم ہوجائے تو مالک کا نقصان بھی نہ ہو۔ساری دنیا میں ان کے اتنے محنتی ، ذہین ،ایذادہندہ ، کینہ پرور،خودغرض ،قوم پرست ،وطن پرست انسان آپ کو کہیں نہیں ملیں گے ۔ان کا سارارجحان سائنس کی ترقی کے نام پرایسے ایسے خطرناک نئے نئے ہتھیار روز بناتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ وہ ساری دنیا کوتباہ کر کے دنیا پرحکمرانی کرسکے۔ یہاں کے لوگ اتنے مضبوط اوربے حس ہوتے ہیں کہ وہ دنیا کی کسی بھی کونے جاکر بس جاتے ہیں ۔ ان کی ترقی کا اگریہی حال رہا تو وہ دن دورنہیں کہ وہ لوگ ساری دنیا کو برباد کر کے اوردوسرے ملکوں میں ناجائز قبضے کرتے ہوئے ہرجگہ اپنے جھنڈے نہ گاڑدیں ۔وہاں جاکر مجھے یہ احساس ہوا کہ دنیا سے انسانیت ختم ہوگئی'اوراس سفر کے بعد میں اتنا دلبرداشتہ ہوگیا ہوں کہ اور کچھ دیکھنے ، بولنے اور سننے کودل نہیں چاہ رہا ہے ۔یہ کہہ کرتیسرا درویش آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دنیا کی سلامتی کی دعا کرتے ہوئے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

داستان چوتھے درویش کی

اب سب کی نظریں چوتھے درویش کی طرف جم گئی جو بڑے انہماک سے تینوں درویشوں کی داستان سن رہا تھا' اس نے سب کواپنی طرف متوجہ پاکراپنے چہرے پرایک دھیمی سی مسکراہٹ لاکر یوں گویا ہوا۔ پیوستہ اورگزشتہ ساری ملاقاتوں میں ہم سب ایک دوسرے سے مسکراتے ہوئے انتہائی گرم جوشی سے ملتے تھے اورنیک تمناؤں کے ساتھ جدا ہوتے تھے لیکن آج جب تینوں درویشوں کی دل سوز باتیں سن کر ویسے تو میں بھی کچھ دیر تک ملول ہوگیا اورانسانیت پر سے میراایقان بھی کچھ ڈگمگا گیا۔لیکن میرے سفر کے تجربات نے مجھے پھر سے حوصلہ دیا کہ میں آپ کو امید اورحوصلے کو گوش گذار کروں ۔تو بھائیو! میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ایسے ملک کی طرف نکل جاؤں جس کا ماضی وسیع ہے اورحال دیکھ لوں اور مستقبل کے بارے میں تعین کرلوں تو میں شمال کے ایک ملک میں پہنچ گیا۔ میں جس مقام پر پہلا پڑاؤ ڈالا وہاں بے حدغریبی تھی لیکن لوگوں میں خلوص تھا،محبت تھی ، احساس تھا۔ مجھ اجنبی کوانہوں نے بے حدآؤبھگت کی ،سونے کو

جگہ دی چاہے وہ معمولی جھونپڑی کیوں نہ تھی اور خود باہر کھلے میں سو گئے۔ میرے سامنے جو کچھ بھی ان کے گھر میں کھانے کو تھا رکھ دیا اور خود بھوکے رہ گئے۔ انہوں نے نہ میرا نام پوچھا نہ ذات نہ وطن بس یہی کہتے رہے کہ مہمان اوپر والے کا وردان ہوتا ہے۔ وہاں سے نکل کر میں شہر پہنچ گیا یہاں ایک الگ ہی دنیا نظر آئی۔ بھانت بھانت کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں ہر رنگ ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگ لیکن ان سب سے مل کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں لوگ رنگ و روپ مقام یا ذاتوں کی بنیادوں پر نہیں رہتے بس یہ سوچ کر رہتے ہیں کہ ہم سب انسان ہیں اور ہمارا مذہب انسانیت ہے۔ یہاں ہر نسل ہر قوم اور ہر رنگ کے لوگ ہیں لیکن کسی کو کسی سے شکایت نہیں۔ دوستیاں بے لوث ہیں اور دشمنیاں صرف وقتی۔ یہاں غریبی بھی ہے اور امیری بھی ہے لیکن ہر دو اتنی ہی عزت سے زندگی گذارتے ہیں یہاں ہر کوئی پیار بانٹتا ہے اپنا وقت نکال کر دو جھگڑا کرنے والوں کی صلح کرا دیتے ہیں۔ بنا پوچھے مشورے دیتے ہیں۔ ہر مذہب والے ہر کسی کے لئے دعاء کرتے ہیں صرف اپنے مذہب والوں کے لئے نہیں۔ امن کے سامان زیادہ بناتے ہیں بجائے تباہی کے ہتھیار کے۔ یہاں پر ہر ایک کا درد سب کا درد ہوتا ہے اور ہر ایک کی خوشی سب کی خوشی، یہاں ہر عید سب کی اور ہر تہوار سب کا ہے، یہاں کوئی کسی پر بیجا ظلم نہیں کرتا، یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔ وقتاً فوقتاً یہاں پر بھی برائی پھیلانے والے فتنے منہ اٹھاتے رہتے ہیں لیکن امن پسند اور بھائی چارگی چاہنے والوں کی وجہ سے ان کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اس دیش کا نام ہے امید اور ساری دنیا اس سے انسانیت اور بھائی چارگی کا سبب سیکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ایک بار ایک معصوم بچے نے چار موم بتیاں جلا کر باہر چلا گیا اس کے باہر جاتے ہی پہلی موم بتی یہ کہہ کر بجھ گئی کہ میں امن ہوں زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد دوسری موم بتی یہ کہہ کر بجھ گئی کہ میں محبت ہوں دیر پا نہیں رہ سکتی۔ اس کے بعد تیسری موم بتی یہ کہہ کر بجھ گئی کہ میں دولت ہوں ایک جگہ نہیں رہ سکتی۔ وہ لڑکا جو دوبارہ کمرے میں آیا تو صرف ایک موم بتی کو جلتا ہوا دیکھ کر اُداس ہو گیا تو وہ موم بتی بولی کہ تم بالکل اداس مت ہو میں امید ہوں اور میری مدد سے تم باقی موم بتیوں کو پھر سے جلا سکتے ہو۔ ویسے ہی میں جس ملک کی سیر سے واپس آیا ہوں وہ امید کا ملک ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس ملک کی بھائی چارگی انسانیت اور پیار کی روشنی سے ہم پھر ساری دنیا کو جنت مقام بنا سکتے ہیں وہ ملک ''ہندوستان'' ہے۔ یہ سنتے ہی باقی تینوں درویشوں کے چہرے پھر سے کھل اٹھے۔ اور سب کے سب پورے امید اور ایقان کے ساتھ یہ وعدہ کرتے ہوئے کہ دوبارہ ایک سو سال بعد اسی جگہ ملیں گے۔ طے کر کے خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہو گئے۔

مظہر قادری، حیدرآباد
9392488219

جمیل نظام آبادی

نظم ''رنگ''

کتنے رنگوں میں تجھ کو دیکھا ہے
تیرا ہر رنگ یاد ہے مجھ کو
وہ سیا ہ رنگ تیری بالوں کا
صندلی رنگ تیرے گالوں کا
تیرے ہاتھوں میں وہ حنائی رنگ
تیرے ماتھے کا دلربائی رنگ
ایک رنگ تیرے مسکرانے کا
دل پہ سو بجلیاں گرانے کا
لال چہرے پہ رنگ غصے کا
صندلی رنگ ہنستے چہرے کا
ایک رنگ تیرے روٹھ جانے کا
ایک آفت کے سر پہ آنے کا
خود بخود ماننے کا تیرا رنگ
پیار پہچاننے کا تیرا رنگ
شوخیوں اور شرارتوں کا رنگ
چاہتوں اور محبتو ں کا رنگ
ناز انداز اور حیا کا رنگ
اک انا کا تو اک وفا کا رنگ
کتنے رنگوں کی مجھ پہ بارش تھی
کتنی اُلفت تھی کیا نوازش تھی
میں شرابور تیرے ہر رنگ میں
تیرا ہر رنگ یاد ہے مجھ کو

oOo

9-19-64
نیو واٹر ٹینک، مالا پلی
نظام آباد 503001 تلنگانہ

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل

غزل

مری نظر میں تخیّل کے باب اور بھی ہیں
یہ سچ ہے چرخِ ادب پر شہا ب اور بھی ہیں
مبارک ان کو نئی فکر اور نیا اسلوب
ہمارے پیش نظر تو نصاب اور بھی ہیں
نظر شناس ہوں میں سرحدِ تغزّل کا
مرے چمن میں مہکتے گلاب اور بھی ہیں
خیالِ یار کی محفل ہو یا دیارِ غزل
ہر ایک بزم میں دورِ شراب اور بھی ہیں
نقیبِ امن کے آداب کون سمجھے گا؟
گلوں کے ہار میں خارِ گلاب اور بھی ہیں
شکست وریخت کے خوگر ہوئے تو دل نے کہا
قلم میں شورِ سوال و جواب اور بھی ہیں
شعورذات سے احساسِ کرب جاگا تھا
لہو کے چھینٹے بدن پر جناب اور بھی ہیں
کھڑا تھا وقت کے ملبوس کو لئے میں بھی
معاشرے پہ تشدّد کے خواب اور بھی ہیں
جھلستی دھوپ میں تنہا نہیں ہے تو خوشدلؔ
کہ اس زمانے میں ذی اضطراب اور بھی ہیں

oOo

نظم و غزل

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اشتراک سے اردو ریسرچ اسکالرس کی پانچ روزہ آن لائن تربیتی ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر لی گئی تصویر میں پروفیسر ایس۔ایم۔رحمت اللہ وائس چانسلر مانو حیدرآباد، پروفیسر صدیقی محمد محمود انچارج رجسٹرار، ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/ سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی ڈائرکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی مانو حیدرآباد، ڈاکٹر جہانگیر احساس، مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی، عہدیداران اردو اکیڈیمی مسرس عطا اللہ خان، شیخ اسمٰعیل و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں۔

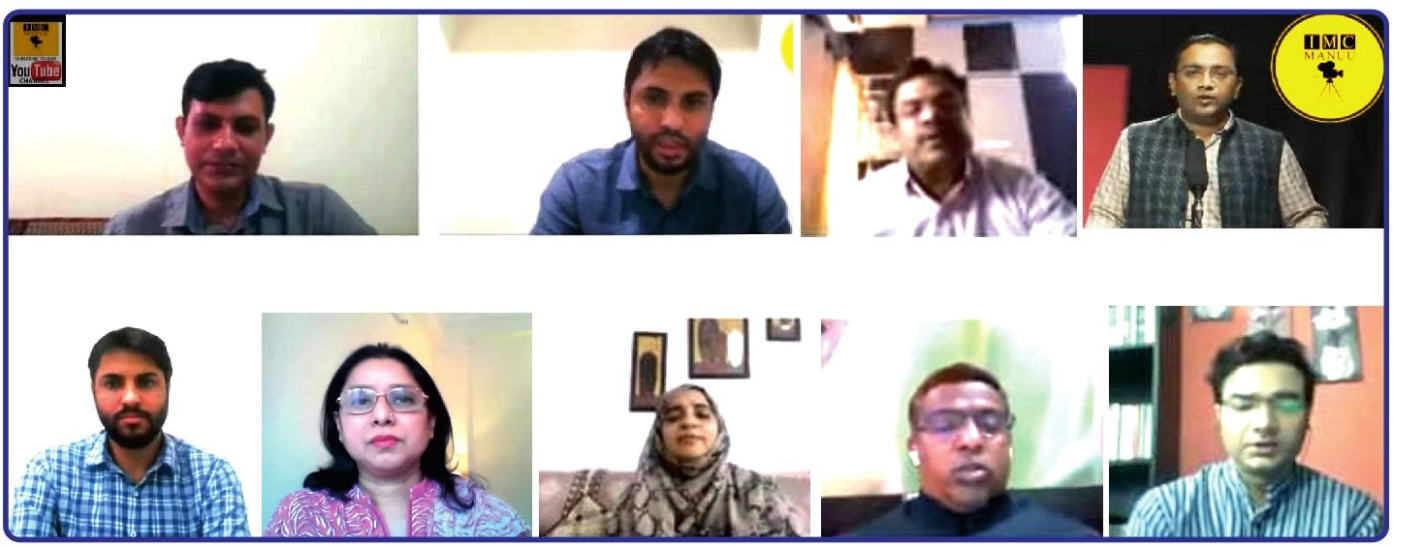

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اشتراک سے اردو ریسرچ اسکالرس کے پانچ روزہ آن لائن تربیتی ورکشاپ میں ریسورس پرسنس طلبہ کو لیکچرز دیتے ہوئے

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY | Vol. 06 | No. 5 | May 2021

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معذورین و معمرین حکومت تلنگانہ، اُردو اکیڈیمی کی جانب سے آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے کارناموں پر محیط کتاب ''شوکت عثمانیہ'' کی رسم اجراء تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ)، عزت مآب مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، صدر نشین تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی جناب ڈاکٹر محمد رحیم الدین انصاری، جناب ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ، جناب سردار سلیم و دیگر عہدیداران و اراکین عملہ اردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website: urduacademyts.com

اقبال خلشؔ

غزل

شمع احساس کی دل میں کبھی جلتی ہی نہیں
اس پہاڑی پہ جمی برف پگھلتی ہی نہیں

موت کے سامنے انسان کی چلتی ہی نہیں
دوستو یہ وہ بلا ہے کہ جو ٹلتی ہی نہیں

خلق و کردار کی غفلت کو بُھلا بیٹھی ہے
ورنہ پستی میں نئی نسل پھسلتی ہی نہیں

ہو نہ ہو آپ کا رشتہ ہے کوئی باطل سے
ورنہ سچّائی مری آپ کو کھلتی ہی نہیں

نیک نامی پہ کوئی حرف نہ آنے دینا
یہ وہ چادر ہے کہ دوبارہ اُجلتی ہی نہیں

نفس کو ہم نے سلیقہ سے دبا رکھا ہے
اب طبیعت کسی نعمت کو مچلتی ہی نہیں

خواب دیکھے ہی نہ جائیں یہی بہتر ہے خلشؔ
حسبِ منشا کبھی تعبیر نکلتی ہی نہیں

oOo

ٹیکری پورہ، آکوٹ 444101
ضلع اکولہ (مہاراشٹرا)
موبائل 9822724299

الطاف شہریار (جدہ)

غزل

اذیتوں کے سفر سے گزر رہے ہیں ہم
خود اپنی ذات کے اندر اتر رہے ہیں ہم

بدن پہ خون کے دھبے یہی بتاتے ہیں
کہ لمحہ لمحہ یوں قسطوں میں مر رہے ہیں ہم

یہ مصلحت کی امامت کو کون سمجھائے
کہ مسجدوں کو بھی بازار کر رہے ہیں ہم

غمِ حیات کو رختِ سفر میں باندھے ہوئے
تمام عمر ہی محوِ سفر رہے ہیں ہم

ٹھٹھک گئے ہیں اندھیرے وجود سے اپنے
چمک اٹھی ہے یہ دھرتی جدھر رہے ہیں ہم

یوں اپنے آپ کو پانے کی جستجو لے کر
دریدہ حال سدا در بدر رہے ہیں ہم

یہ ہسپتال کی تشخیص سے کُھلا ہم پر
کہ رفتہ رفتہ جہاں سے گزر رہے ہیں ہم

ہے کیسا قرض یہ الطاف اپنی ہستی کا
نفس نفس جسے قسطوں میں بھر رہے ہیں ہم

oOo

نظمیں